جلد ۲

- مخلوق کی وجہ سے عمل چھوڑنا
- چھوٹے پر زیادتی کی معافی مانگنا۔
- تکبر کا علاج ، ذلتِ نفس۔
- رمضان کے لئے اعمال مؤخر کرنا۔
- اللہ تک پہنچنے کے راستے
- تصرف کی حقیقت
- اعمال میں رسوخ پیدا کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم، وعلی
کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین، أمابعد

الحمد للہ "اصلاحی مجالس" کی دوسری جلد آپ تک پہنچانے کی سعادت کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس کے آنے میں قدرے تاخیر ہو گئی، لیکن ہر چیز کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ وہ چیز نہ اس سے پہلے وجود میں آسکتی ہے نہ بعد میں۔

جلد اوّل میں "رذائل" کا بیان شروع کر دیا گیا تھا، جو "انفاس عیسیٰ" کے تیسرے باب "تہذیبات" کی تشریح پر مشتمل ہے، جبکہ "انفاس عیسیٰ" کے پہلے دو باب باب اوّل "تعلیمات" اور باب دوم "تحقیقات" کی تشریح باقی تھی۔ اصولاً تو ترتیب سے ہر باب کی تشریح آنی چاہئے تھی، لیکن جس وقت

رمضان المبارک کی ان مجالس کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا، اس وقت "باب سوم تہذیبات" سے متعلق بیانات کے ریکارڈ دستیاب ہوگئے تھے، اور شروع کے دو ابواب کے ریکارڈ اس وقت دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ان کو پہلے قلم بند کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن بعد میں شروع کے بیانات کے ریکارڈ کی تلاش شروع کی تو الحمد للہ اس میں کامیابی ہوگئی، اور اب الحمد للہ جلد دوم باب اوّل کے بیانات پر مشتمل ہے جس میں مجاہدات کی حقیقت، اور اس کی اقسام، تصرف کی حقیقت، اللہ تک پہنچنے کے راستے، شیخ کی ضرورت، ہمت اور اخلاص وغیرہ کا بیان آگیا ہے۔ البتہ چونکہ جلد اوّل کے آخر میں "تکبّر اور اس کا علاج" کا بیان چل رہا تھا۔ اس کے بعض بیانات جلد اوّل میں آنے سے چھوٹ گئے تھے۔ اس لئے جلد ثانی کے ابتدائی ۶ بیانات "تکبّر اور اس کے علاج" پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور صدق و اخلاص کے ساتھ مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ میمن

۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
مجلس نمبر ١٧	٢٧
مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہئے	٢٧

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
خاص لباس کا اہتمام نہ کریں	۶۴
کونسی صورت کبر میں داخل ہے؟	؍؍
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۶۵
عبدیت کا پیکر تھے	۶۷
تکبّر کا علمی علاج	؍؍
تکبّر کا عملی علاج	۶۸
بزرگوں کی مختلف ادائیں	۶۹
حضرت شیخ الہند کی تواضع	؍؍
حضرت مولانا رشید احمد گنگوھیؒ اور تواضع	۷۰
اتحاد قائم نہ ہونے کی وجہ تکبر ہے	۷۱
دو متکبّروں میں اتحاد کی مثال	۷۲
مجلس نمبر ۲۰	۳۰
چھوٹے پر زیادتی کی صورت میں معافی کا طریقہ	۷۳
چھوٹے پر زیادتی ہو جاتی ہے	۷۶
معافی مانگنے کا نقصان	۷۷

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
زکوٰۃ کا حساب لگانے میں غلطی	۱۱۴
ایک مثال	۱۱۵
زکوٰۃ کی رقم کو روک کر رکھنا	۱۱۶
مال زکوٰۃ میں مسکین کا حق متعلق ہو گیا	″
مسکین پر فاقے اور تم پر عیاشی	۱۱۷
کمیت اور کیفیت کا فرق	″
ایک مثال	۱۱۸
محلے کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنا	۱۱۹
حضرت شیخ الہندؒ کا ایک جملہ	″
رمضان تک زندہ رہنے کی گارنٹی ہے؟	۱۲۰
وقت کے تقاضے پر عمل کرنا دین ہے	۱۲۱
اپنا شوق پورا کرنا دین نہیں	″
کیا نیک کام رمضان کے ساتھ خاص ہیں؟	۱۲۲
رمضان ایک تربیتی کورس	۱۲۳
دل کو گناہ کے داغ سے بچاؤ	″
رمضان کے بعد تلاوت جاری رکھو	″
رمضان کے بعد بھی عبادات پر قائم رہو	۱۲۴

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۲۴

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
تصرف کی مثال	۲۱۷
ہمت اور اعمال کی مثال	۲۱۸
اتباعِ سنّت سے وصول تیزی سے ہوتا ہے	۲۱۹
اتباعِ سنّت میں "محبوبیت" کی شان	۲۲۰
ایک ایک سنّت پر عمل کرتے جاؤ	۲۲۱
تمام سنّتوں پر عمل کرو	۲۲۲
مجلس نمبر ۲۸	۲۲۵
جبلّی صفات رذیلہ کی اصلاح	۲۲۵
مادہ جبلّی فعل اختیاری	۲۲۷
غصّہ جبلّی صفت ہے	۲۲۸
غصّہ کے مقتضیٰ پر عمل	۲۲۹
اس وقت غصّہ پر عمل مت کرو	۲۳۰
غصّہ میں بچے کو مارنا	〃
غصّہ کے وقت یہ سوچا کرو	۲۳۱
"حسد" ایک فطری جذبہ ہے	۲۳۲

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
	۳۰۶

صدق اللہ العظیم

مجلس نمبر ۱۷

مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہئے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱- لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲
مجلس نمبر : ۱۷
صفحات : ۱۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۱۷

مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہئے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ربِّ الۡعَالِمِیۡنَ ۔ والعاقبة للمتقین ۔ والصّلوٰة والسّلام علٰی رسوله الکریم ۔ وعلٰی آله واصحابه اجمعین ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

تکبّر مع اللہ کی صورت

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تکبّر میں جب غلو ہو جاتا ہے اور اس کی جڑ پختہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی تکبر کرنے لگتا ہے۔ مثلاً دعا میں عاجزی اور خشوع کر رہا تھا، رونے کی صورت بنا کر گڑ گڑا رہا تھا کہ سامنے سے کوئی دوسرا شخص آ گیا تو اب گڑ گڑانا

چھوڑ دیا کہ دیکھنے والے کی نظر میں سبکی نہ ہو، یہ تکبر مع اللہ ہے کہ اس کو اللہ کے سامنے عاجزی اور ذلت کی صورت بنانے سے بھی دوسروں کی نظر میں ذلت و عار آتی ہے، پس مخلوق کے لئے کسی عمل عبادت کو ترک کرنا تکبر ہے۔

(انفاس عیسی ص ۱۵۷)

تکبر مع الناس اور تکبر مع الخلق تو برا ہے، ہی لیکن اللہ جل شانہ کے ساتھ تکبر کرنا بدترین قسم کا تکبر ہے۔ مثلاً ایک شخص دعا میں روتا ہے اور گڑگڑاتا ہے یا رونے کا منہ بناتا ہے، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ عمل پسندیدہ عمل ہے، لیکن کسی اور کے سامنے اپنی دعا میں یہ عمل کرتے ہوئے اگر انسان یہ محسوس کرے کہ میری ذلت ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے میں اپنی خفت محسوس کر رہا ہے۔ العیاذ باللہ۔ یہ بہت خطرناک قسم کا تکبر ہوا۔

مخلوق کے لئے عمل کا ترک

مذکورہ ارشاد کے آخر میں حضرت والا نے یہ اصول بیان فرمادیا کہ "پس مخلوق کے لئے کسی بھی عمل عبادت کو ترک کرنا تکبر ہے"۔ جس طرح مخلوق کے لئے عمل کرنا ریاکاری اور دکھاوا ہے، یعنی مخلوق کے خاطر عمل کرنا کہ مخلوق مجھے دیکھ کر مجھے عبادت گزار سمجھے، جس طرح یہ عمل ریا ہے بلکہ شرک کے قریب پہنچ جاتا ہے، اسی طرح ترک عمل للخلق بھی جائز نہیں، اس لئے یہ

ترکِ عمل یا تو ریا ہو گا یا تکبر میں داخل ہو گا۔

تکبر مع اللہ کی مثال

مثلاً نماز کا وقت آ گیا اور آپ اس وقت ایسی جگہ پر ہیں جہاں نماز کا ماحول نہیں، اب اگر آپ وہاں نماز پڑھنے سے اس لئے شرمائیں کہ لوگ مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر معلوم نہیں کیا سمجھیں گے۔ العیاذ باللہ۔ تو یہ ترک عمل لِلخلق ہے جو جائز نہیں۔ آج کل بہت کثرت سے یہ صورت پیش آتی رہتی ہے، مثلاً جو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں، انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جہاز میں نماز معاف ہے اور نماز کو چھوڑنے کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ تو بیٹھے ہیں، اب اگر میں ان سب کے سامنے کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا تو ایک بھدّی صورت پیدا ہو جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے، اب جو شخص اس وقت نماز کو ترک کر رہا ہے وہ مخلوق کے سامنے اس عاجزی کا اظہار نہیں کرنا چاہ رہا ہے، اس لئے کہ اس سے میری ہیٹی ہو گی، تو یہ صورت "تکبر مع اللہ" ہے۔

ایسے مقامات پر نماز نہ چھوڑے

غیر مسلم ملکوں میں میرا اکثر جانا ہوتا ہے، وہاں بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں غیر مسلموں کی آمد و رفت ہے یا جہاں غیر مسلم کثرت سے موجود ہیں، وہاں بعض مسلمان نماز پڑھنے سے کتراتے ہیں، اس

لئے کتراتے ہیں کہ اگر ہم یہاں نماز پڑھیں گے تو ہم ان کے سامنے تماشہ بن جائیں گے۔ اب اس ڈر سے نماز چھوڑنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غیر مسلم لوگ ہمارا مذاق اُڑائیں اور ہمیں تماشہ سمجھیں، اور اس نماز کی ہیئت کو ذلت کی ہیئت سمجھ کر ترک کرنا اور دوسرے لوگوں کے سامنے اس ہیئت میں آنے سے پرہیز کرنا یہ "تکبر مع اللہ" ہے۔ واقعۃً بعض جگہیں ایسی ہیں کہ اگر آدمی وہاں نماز پڑھے تو ایک تماشہ بن جاتا ہے اور لوگ آکر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اندلس کے ائیر پورٹ پر نماز

اب تو چونکہ مسلمان ہر جگہ پہنچ گئے ہیں، اس لئے الحمدللہ نماز اتنی اجنبی نہیں رہی، مجھے تو ایسی ایسی جگہوں پر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں ایک انسان بھی کلمہ گو نہیں تھا، لیکن سب سے زیادہ حسرت مجھے اندلس میں ہوئی، وہ اندلس جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی، اور آٹھ سو سال تک جس کی فضاؤں میں اذان کی آوازیں گونجتی رہیں، جب میں وہاں ائیر پورٹ پر اترا تو نماز کا وقت تھا، نماز پڑھنے کے لئے ایک گوشہ تلاش کیا تاکہ وہاں نماز ادا کریں، میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے، چنانچہ ایک گوشہ میں ہم دونوں نے نماز شروع کر دی، وہ گوشہ ایسا نہیں تھا جو بہت نمایاں ہو، اس لئے کہ آدمی نماز پڑھنے کے لئے ایسا گوشہ تلاش کرتا ہے جو ذرا آڑ میں ہو، لیکن میں نے دنیا میں لوگوں کے لئے نماز کو اتنی انجانی اور اجنبی محسوس نہیں کی جیسی وہاں محسوس کی، پہلے تو ہمیں نماز پڑھتا دیکھ کر دو چار آدمی کھڑے ہو گئے، پھر وہ

لوگ دوسروں کو بلا بلا کر لائے کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے، پھر تو باقاعدہ ہمیں دیکھنے کے لئے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، گویا کہ آج تک انہوں نے یہ نظارہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

مجھے حسرت اس بات کی ہوئی کہ مجھے امریکہ میں اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جو کفر کے بڑے بڑے مراکز ہیں، ان میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن کہیں بھی نماز اتنی اجنبی محسوس نہیں کی گئی جتنی اندلس کے ائرپورٹ پر محسوس کی گئی۔

اب اگر آدمی اس وجہ سے نماز چھوڑ دے کہ اگر میں یہاں نماز پڑھوں گا تو یہ لوگ تماشہ بنائیں گے اور برا سمجھیں گے یا نماز پڑھنے سے میری خفت ہو گی، تو یہ خطرناک خیال ہے اور یہ "تکبّر مع اللہ" ہے۔

ایسے موقع پر نماز مؤخر کردے

بعض جگہ نماز کو مؤخر کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے سے کہیں اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہو جائے، مثلاً ایک شخص ریل گاڑی میں سفر کر رہا ہے یا جہاز میں سفر کر رہا ہے، اور نماز پڑھنے کی اتنی جگہ ضروری ہے جس میں آدمی سجدہ کر سکے، لیکن نماز پڑھنے کے لئے اتنی جگہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے کو تکلیف پہنچانی پڑے گی یا کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا پڑے گا، تو اگر اس تکلیف سے دوسرے کو بچانے کے لئے آدمی نماز مؤخر کر دے تو یہ مؤخر کرنا درست ہے، اس لئے کہ دوسرے کو تکلیف دے کر نماز پڑھنے سے

غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی ہوگی، اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ اسلام ایسا مذہب ہے جو لوگوں کو تکلیف دیتا ہے، لہٰذا اس وجہ سے نماز کا مؤخر کرنا صحیح ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

دوسری انتہاء

بہر حال! ایک انتہاء تو یہ ہے کہ لوگ جہازوں میں نماز پڑھنے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ کہیں دوسروں کے سامنے تماشہ نہ بن جائیں اور نماز پڑھنے سے کہیں ہماری خفت نہ ہو۔ العیاذ باللہ۔ یہ تو تکبر مع اللہ ہے۔ دوسری انتہاء وہ ہے جو اس واقعہ سے سامنے آتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ جہاز میں سفر کر رہا تھا، جہاز بھی چھوٹا تھا اور سفر بھی صرف ایک گھنٹے کا تھا، نماز کا وقت آگیا تھا، لیکن منزل پر پہنچ کر جہاز سے اتر کر آرام سے نماز پڑھ سکتے تھے، مگر میرے کچھ دوست جو میرے ساتھ تھے، ان کا اصرار یہ تھا کہ نماز جہاز ہی میں پڑھنی ہے، یہاں وضو کرنا ہے، اذان دینی ہے اور پھر جماعت سے نماز پڑھنی ہے۔ چنانچہ جب وضو کرنے کا ارادہ کیا تو جہاز کے عملہ نے منع بھی کیا کہ یہاں وضو کرنا مشکل ہوگا، لیکن وہ لوگ نہیں مانے اور اصرار کیا کہ ہم تو وضو کریں گے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے غسل خانے میں جاکر اس شان سے وضو کیا کہ غسل خانے کا سارا فرش گیلا ہو گیا اور اس میں پانی بھر گیا۔ حالانکہ آدمی جب وضو کرے تو اس طرح وضو کرنا چاہئے کہ بعد میں آنے والے کو غسل خانے کے استعمال سے تکلیف نہ ہو، لیکن ان حضرات نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

اس کے بعد اذان دی اور پھر کہا کہ ہم تو جماعت سے نماز پڑھیں گے، اب کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے، ان سب کے درمیان انہوں نے صف بنا کر نماز شروع کردی، چونکہ بہرحال جہاز کے عملے کے لوگ مسلمان تھے، انہوں نے ان کی رعایت تو کی، لیکن ہر ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو انہوں نے کیا حرکت کی ہے۔ اب اگر ایک گھنٹہ کے بعد آرام سے منزل مقصود پر پہنچ کر وضو کر کے نماز پڑھ لیتے تو اس میں کیا حرج ہو جاتا، لیکن اس عمل کے نتیجے میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں غسل خانہ الگ خراب کیا۔ اب جو شخص بھی غسل خانہ میں جارہا ہے وہ ان کو برا کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، لوگوں کا راستہ الگ بند کیا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ ابھی نماز کو رہنے دو، اور میں بھی جہاز سے اتر کر نماز پڑھوں گا، لیکن ان لوگوں نے بالکل نہیں سنی، یہ دوسری انتہاء ہے۔

ہوائی جہاز میں وضو کرنے کا طریقہ

اس دوسری انتہاء میں ہم جیسے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان باتوں کا خیال نہیں ہوتا۔ جہاز کا عملہ ہمیشہ لوگوں کو جہاز میں وضو کرنے سے منع کرتا ہے، اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص غسل خانہ میں جاکر وضو کرے گا تو اس کو روک دیتے ہیں، اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ جب یہ شخص وضو کرے گا تو سارا غسل خانہ خراب کر کے آئے گا۔ میں جہازوں میں اکثر سفر کرتا رہتا ہوں، اور جہاز کے غسل خانہ میں ہمیشہ وضو کرتا ہوں، مجھے آج

تک کسی نے وضو کرنے سے منع نہیں کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ میں اس بات کا اہتمام کرتا ہوں کہ جب میں وضو کر کے باہر نکلوں تو فرش پر پانی کی ایک چھینٹ بھی باقی نہ رہے اور غسل خانے کا واش بیسن بالکل صاف ستھرا رہے، تاکہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لہٰذا اگر ہم صفائی کا ذرا اہتمام کریں تو کوئی مشکل کام نہیں، غسل خانے میں تو لئے موجود ہوتے ہیں اور ٹیشو پیپر، ٹوئیلیٹ پیپر ہوتے ہیں، آدمی فرش اور واش بیسن کو ان سے صاف کر لے، لیکن ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ بس ہم تو للہ فی اللہ وضو کر کے آگئے، اب بعد میں آنے والے پر کیا گزرے گی، اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

دوہرا گناہ

حالانکہ اس گندگی کے نتیجے میں دوسروں کو تکلیف دینے کا گناہ الگ ہوگا، اور لوگوں کو اسلام سے اور دین کے شعائر سے متنفر کرنے کا گناہ الگ ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ حدیث شریف میں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں:

یَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا وَاَبْشِرُوْا وَلاَ تُنَفِّرُوْا۔

(صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ماکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولهم بالموعظة والعلم)

لوگوں کے لئے دین کو آسان کرو اور مشکل مت بناؤ،

لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور ان کے اندر نفرت مت پیدا کرو۔

آج ہم نے ان چیزوں کو دین سے خارج ہی کر دیا ہے، آج ہماری مسجدوں کے غسل خانوں اور بیت الخلاء کو جا کر دیکھو تو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اندر داخل ہونا مشکل ہے، اور داخل ہونا اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ یہاں تو متقی اور پارسا لوگ رہتے ہیں، یہاں رہنے والے علماء کرام ہیں اور صوفیاء عظام ہیں، ان کو صفائی ستھرائی سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے ان کا غسل خانہ گندہ ہے اور اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ ان علماء کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ یہ بھی کوئی گناہ کا کام ہے یا کوئی ناجائز کام ہے۔

یہ حرکت گناہ کبیرہ ہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کا واقعہ یاد آیا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ہم نے غسل خانہ کو استعمال کیا اور اس کو صاف کئے بغیر اور پانی بہائے بغیر باہر آگئے، جب والد صاحبؒ کو پتہ چلا تو آپ نے ہمیں بلایا اور پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم نے یہ معمولی حرکت کی؟ تمہاری یہ حرکت گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے، اور تم یہ سمجھ کر آگئے کہ ہم نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب

دیکھئے! یہ جو کافر اور غیر مسلم ہیں، ان کا کفر باعث نفرت ہے، لیکن انہوں نے کچھ چیزیں ایسی اختیار کرلیں جو ہماری تھیں، ان چیزوں کے اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عروج اور ترقی دیدی۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں یہ طاقت نہیں کہ وہ ابھر سکے، اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقاً۔ (سورۂ اسراء، آیت ۸۱) باطل تو ڈوبنے کے لئے اور ذلیل ہونے کے لئے ہے، اس میں ابھرنے کی طاقت نہیں، لہٰذا اگر تم کبھی یہ دیکھو کہ باطل ابھر رہا ہے، عزت حاصل کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس باطل کو ابھار دیا ہے، حق کے سہارے کے بغیر باطل کبھی نہیں ابھر سکتا۔

لہٰذا یہ جتنی ترقی یافتہ قومیں جو آج کی دنیا میں ترقی کرتی نظر آرہی ہیں، چاہے وہ امریکہ ہو یا یورپ ہو یا کوئی اور ہو، یہ ترقی ان کو ان کے کفر کی وجہ سے اور باطل کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے، بلکہ انہوں نے کچھ اچھے کام اختیار کر لئے، مثلاً محنت، امانت، دیانت، حسن معاشرت وغیرہ جو اصل میں اسلام کی تعلیمات تھیں، ان کو اختیار کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقی دیدی، اور فرمایا کہ ٹھیک ہے تم نے اچھا کام کیا، اس کا صلہ ہم تمہیں دنیا میں دیدیتے ہیں، آخرت میں تو تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

وَمَا لَہٗ فِی الآخرۃِ مِن نَصِیْبٍ۔ (سورۃ شوریٰ، آیت ۲۰)

ایک سبق آموز واقعہ

میں ایک مرتبہ برطانیہ میں ریل کا سفر کر رہا تھا اور برمنگھم سے ایڈنبرا جارہا تھا، پانچ چھے گھنٹے کا سفر تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، جب وہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ غسل خانہ پر ''مشغول'' کی تختی لگی ہوئی ہے، میں واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد میں پھر گیا تو دیکھا کہ پھر بھی ''مشغول'' کی تختی لگی ہوئی ہے میں پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد جب گیا تو میں نے دیکھا کہ اب ''خالی'' کی تختی لگی ہوئی ہے، لیکن ایک خاتون باہر انتظار میں کھڑی ہیں، میں سمجھا کہ شاید ان خاتون کو پتہ نہیں ہے کہ یہ غسل خانہ خالی ہے، اس لئے میں نے ان خاتون سے کہا کہ غسل خانہ خالی ہے، آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں۔ اس خاتون نے کہا کہ ہاں، یہ خالی ہے، مگر میں انتظار کر رہی ہوں، میں نے پوچھا کہ اب کس کا انتظار ہے؟ خاتون نے کہا کہ میں ابھی اندر سے فارغ ہو کر باہر نکلی ہوں، لیکن جس وقت میں فارغ ہوئی، عین اس وقت گاڑی اسٹیشن پر رک گئی، اور قانون یہ ہے کہ جس وقت اسٹیشن پر گاڑی رکی ہوئی ہو، اس وقت ''فلش'' کرنا منع ہے، اس لئے میں اس وقت ''فلش'' نہیں کر سکی، اب میں گاڑی کے روانہ ہونے کا انتظار کر رہی ہوں، تاکہ جب یہ اسٹیشن سے روانہ ہو جائے تو اس کے بعد فلش کروں اور پھر اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھوں، اس لئے انتظار میں کھڑی ہوں۔

ہمارا طرز عمل

جب میں نے اس خاتون کی یہ بات سنی تو مجھے بڑی عبرت ہوئی کہ دیکھو! یہ وہ تعلیم ہے جو ہمارے حضرت والد صاحبؒ نے فرمائی تھی کہ بغیر فلش کئے بیت الخلاء سے واپس آجانا گناہ کبیرہ ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس خاتون نے ایک تو اس بات کا اہتمام کیا کہ اسٹیشن پر "فلش" نہ ہو۔ ہمارے یہاں کوئی شخص اس کا اہتمام کرے گا؟ حالانکہ ہر غسل خانے پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ "جب تک گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو، اس وقت تک اس کو استعمال نہ کیا جائے" لیکن کوئی دھیان نہیں کرتا۔ یہ اس لئے لکھتے ہیں کہ پلیٹ فارم پر ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، اگر گاڑی کھڑی ہونے کے وقت کوئی شخص غسل خانہ استعمال کرے گا تو پلیٹ فارم پر گندگی پھیلے گی اور اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی اور صحت کے لئے بھی نقصان دہ ہے، مگر ہم میں سے کوئی اس کا لحاظ نہیں کرتا۔

ایک عمل میں کئی گناہ

اور پھر اس کا لحاظ نہ کرنے کو کبھی کوئی شخص یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے، حالانکہ اس ایک عمل میں کئی گناہ شامل ہیں۔ ایک گناہ تو یہ ہے کہ جب آپ کی وجہ سے ایسی جگہ پر گندگی پھیلی جو لوگوں کی گزرگاہ ہے، تو اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ یہ گاڑی آپ کی ملکیت

نہیں ہے، بلکہ آپ کرایہ دے کر اس کو سفر کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا جن شرائط پر آپ کو گاڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ان شرائط کی پابندی آپ کے اوپر لازمی ہے، اگر آپ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو یہ عقد اجارہ کی خلاف ورزی ہوگی، لہٰذا ان شرائط کے خلاف آپ کے لئے اس گاڑی کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

حق العبد کے ضیاع کا گناہ

اور ان دونوں گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اب اگر تمہارے اس عمل سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا تو پھر کس کس سے معافی مانگو گے؟ اس لئے یہ گناہ بڑا سنگین ہے، لیکن اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ہم لوگ دوسری انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں، اس کی بڑی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں صحیح فکر عطا فرمائے اور صحیح فہم عطا فرمائے آمین۔

مساجد کے استنجاء خانوں کا حال

اسلام جو لطافت کا، طہارت کا، نظافت کا دین تھا، آج ہم نے اپنے طرز عمل سے اس دین کو گندگی کا دین بنادیا ہے۔ برطانیہ میں خاص طور پر یہ منظر نظر آتا ہے کہ آپ پورے ملک میں کہیں بھی چلے جائیں، چاہے کسی آفس میں چلے جائیں، یا کسی تفریح گاہ پر چلے جائیں، ہر جگہ آپ کو صاف ستھرے غسل خانے

ملیں گے۔ الا ماشاء اللہ۔ لیکن اگر کسی مسجد کے غسل خانے میں چلے جائیں تو "العیاذ باللہ" اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ سوائے ان چند مساجد کے جو بہت اچھی بنی ہوئی ہیں، ان میں صفائی ستھرائی کا نظام اچھا ہے، باقی اکثر مساجد میں صفائی کا نظام خراب ہے۔ اور اس وقت صرف لندن شہر میں ڈھائی تین سو مسجدیں ہیں، جبکہ ایک وقت وہ تھا کہ نماز پڑھنے کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی، لیکن ان میں صفائی کا اہتمام نہیں ہے۔ پورے لندن میں سب سے گندہ علاقہ مسجد کے غسل خانوں کا ہے، اس کے ذریعے ہم اسلام کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں، جو دین طہارت کا، نظافت کا اور لطافت کا دین تھا، اس کو ہم نے گندگی کا دین بنا کر پیش کر دیا۔

ایک انگریز مسلمان کا قصہ

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ دہلی کی جامع مسجد میں ایک انگریز مسلمان ہو گیا، اب مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں آنے لگا، اس نے دیکھا کہ وضو خانے کی نالی گندی ہو رہی ہے، چند روز تک تو وہ دیکھتا رہا، جب کسی اور نے صفائی نہیں کی تو ایک دن وہ جھاڑو لے کر آیا اور پانی ڈال کر اس کی صفائی شروع کر دی۔ ایک صاحب وہاں سے گزرے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ انگریز نالی صاف کر رہا ہے، تو ان صاحب نے کہا کہ "یہ انگریز مسلمان تو ہو گیا لیکن ابھی انگریزیت کی خو بو نہیں گئی۔" مطلب یہ تھا کہ یہ جو صفائی کر رہا ہے یہ انگریزیت کی خو بو ہے۔ العیاذ باللہ۔

بھائی! ہم لوگوں نے اپنا یہ گندہ حلیہ بنا رکھا ہے، یہ فی نفسہ ناجائز تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعہ سے اسلام کی غلط تصویر لوگوں کے سامنے آ رہی ہے، جس کے نتیجے میں لوگ دین کے قریب آنے کے بجائے اور دور ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صفائی کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہئے تاکہ اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۱۸

دوسروں کو حقیر سمجھنے کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸۴/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۱۸

صفحات : ۱۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ؕ

مجلس نمبر ۱۸

دوسرے کو حقیر سمجھنے کا علاج

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین
والصّلاۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم وعلٰی
آلہ واصحابہ اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

دوسرے کو حقیر سمجھنا

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:
اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھو تو اس وقت یہ سوچو کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی، اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں، یا ہم میں ایک ہی برائی ہو لیکن اس

برائی سے بدتر ہو جو اس کے اندر ہے، پھر کس طرح ہم
اس کو گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ
سے کم درجہ سمجھتے ہیں اور کیوں سلام میں ابتداء کرنے سے
عار آتی ہے؟

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۵۸)

غیر اختیاری خیال کے آنے پر مؤاخذہ نہیں

کبھی کسی شخص کے بارے میں خیال آجائے، اور یہ خیال بعض اوقات آجاتا ہے کہ یہ شخص فلاں چیز میں مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں ان سے بڑھا ہوا ہوں، تو تنہا اس خیال کا آجانا کوئی بری بات نہیں اور اس غیر اختیاری خیال پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ بھی نہیں ہے، لیکن بار بار اس خیال کا لانا اور اس خیال کا دل میں بٹھانا اور پھر اس خیال کے مقتضیٰ پر عمل کرنا، یہ سب تکبر میں داخل ہیں، لہٰذا اس کا علاج بھی ضروری ہے۔

ذہین طالب علم کے دل میں اپنی برتری کا خیال

مثلاً چند طلباء ایک جماعت میں پڑھتے ہیں، ایک طالب علم بڑا ذہین اور زیرک ہے، اچھی استعداد کا مالک ہے اور ہر امتحان میں اول نمبر پر آتا ہے، دوسرا طالب علم کند ذہن ہے، پڑھائی میں کمزور ہے، اب جو طالب علم پڑھائی میں تیز ہے، ذہین ہے، زیرک ہے، اس کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں اس کے مقابلے میں اچھی استعداد والا ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ سوچے کہ اگرچہ اس

ایک وصف میں یہ وہ مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں اس سے بڑھا ہوا ہوں، لیکن نہ جانے اس کے اندر کتنے اوصاف ایسے ہوں جس میں یہ مجھ سے فائق ہو، اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کونسا وصف زیادہ مقبول ہو جائے اور میں اس سے پیچھے رہ جاؤں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اندر بہت سی خرابیاں ہوں اور ان کے بارے میں مجھے پتہ بھی نہ ہو، یا میرے اندر ایک خرابی ہو، لیکن وہ خرابی اس طالب علم کی استعداد کی کمزوری کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہو۔

کمزور طالب علم میں نیکی کی برتری حاصل ہے

دیکھئے، اگر ایک طالب علم پڑھائی میں کمزور ہے، لیکن نیک ہے اور اپنے فرائض و واجبات کو ٹھیک بجالاتا ہے، گناہوں سے بچتا ہے، اور ایک طالب علم بڑا ذہین، بڑا زیرک اور بڑا صاحب استعداد ہے اور ہر امتحان میں اول آتا ہے، لیکن گناہوں کے اندر مبتلا ہے یا وہ نمازوں میں کوتاہی کرتا ہے، ایسے طالب علم کے جو اچھے اوصاف ہیں وہ اکارت اور بیکار ہیں، اس لئے کہ جب عمل صحیح نہیں تو علمی استعداد موجود ہونے سے کیا حاصل؟ اگرچہ یہ طالب علم علمی استعداد کے وصف میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے، لیکن اس کے اندر ایک خرابی ایسی ہے جس نے اس کے اچھے وصف پر پانی پھیر دیا۔

اصل خرابی ”بے دین“ ہونا ہے

آج کل لوگ دینی خرابی کو خرابی ہی نہیں سمجھتے، العیاذ باللہ، حالانکہ اصل خرابی اور کمزوری یہی ہے۔ ایک صاحب اپنے بیٹے کا تعارف مجھ سے کرا رہے تھے، کہنے لگے میرا یہ بیٹا بڑا ذہین اور بڑا زیرک ہے، پڑھائی میں بہت تیز تھا، اور اب اس کو فلاں ملک میں اعلیٰ درجے کی ملازمت مل گئی ہے، اور وہاں پر اس نے سارے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے، میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ پھر کہنے لگے، البتہ یہ تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے۔ ان صاحب نے بے دین ہونے کی خرابی کو اس طرح بیان کیا کہ جیسے یہ کوئی بڑی خرابی نہیں ہے، گویا کہ اصل معاملات میں تو یہ ٹھیک ہے، بس یہ ذرا سی کمزوری ہو گئی ہے۔

”بے دین“ ہونے کی مثال

میں نے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گاؤں کے لوگ ایک حکیم صاحب کو ایک شخص کے معائنے کے لئے لائے، وہ حکیم صاحب آئے اور اس کا سر سے لے کر پاؤں تک چاروں طرف سے معائنہ کیا، دیکھنے کے بعد حکیم صاحب کہنے لگے کہ یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی ہے، اس کے سارے اعضاء بالکل ٹھیک ہیں، اس کے ہاتھ بھی ٹھیک ہیں، کان بھی ٹھیک ہے، ناک بھی ٹھیک ہے، بس ذرا سی روح نکل گئی ہے۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں جو تعریف کی، اس پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے کہ

اس کے اندر سب باتیں تو ٹھیک ہیں، بس ذرا سا بے دین ہو گیا ہے۔ العیاذ باللہ، حالانکہ دین کی خرابی اور بد عملی کی خرابی ایسی ہے جو ساری خرابیوں پر بھاری ہے۔ لہٰذا جس شخص کو تم گھٹیا سمجھ رہے ہو، کیا پتہ تمہارے اندر ایک خرابی ایسی ہو جو اس کی خرابی پر بھاری ہو جائے۔

کمتر لوگ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے

اور اگر بالفرض اس کے مقابلے میں تمہارے اندر عیوب کم بھی ہوں، لیکن کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقبول ہے، جو لوگ بظاہر دیکھنے میں معمولی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رُبَّ أشعث مدفوع بالأبواب، لو أقسم على الله لأبرَّه۔

(مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الضعفاء والخاملین)

یعنی ایسا شخص جس کے بال پراگندہ ہیں اور ایسا ہے کہ اگر وہ لوگوں کے دروازوں پر جائے تو لوگ دھکے دے کر نکال دیں، لیکن اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے، مثلاً وہ یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ضرور ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری فرما دیتے ہیں۔ اگرچہ عام لوگوں کی نظروں میں وہ شخص بے حقیقت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات کو نہیں

ٹالتے ہیں کہ جب میرے بندے نے قسم کھالی ہے تو اب میں اس کو جھوٹا نہیں کروں گا۔

جنّت کے اعلیٰ درجات والے لوگ

جنّت میں جن لوگوں کو اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ:

الذین اذا غابوا لم یفتقدوا

(ابن ماجۃ، کتاب الفتن، باب من ترجی لہ السلامۃ من الفتن)

یعنی وہ ایسے لوگ ہیں جب وہ کہیں چلے جائیں اور غائب ہو جائیں تو ان کو کوئی ڈھونڈنے والا بھی نہ ہو اور کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو، مثلاً ایک شخص روزانہ نماز پڑھنے مسجد میں آتا تھا، اگر کسی دن نہ آئے تو کوئی یہ نہ پوچھے کہ فلاں شخص روزانہ آتا تھا، آج کہاں چلا گیا؟ اور اگر وہ کہیں نکاح کا رشتہ لے کر چلے جائیں تو لوگ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیں کہ یہ تو مولوی آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو جنّت میں اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں۔

کسی کے ظاہر پر مت جاؤ

لہٰذا کسی شخص کے ظاہر پر مت جاؤ کہ ظاہری اعتبار سے یہ شخص کیسا ہے، کچھ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہو؟ اس لئے فرمایا کہ کسی انسان کو حقیر مت سمجھو، اور یاد رکھو کہ کسی مسلمان پر حقارت کی نگاہ ڈالنا گناہ

کبیرہ اور حرام ہے اور یہ ایسا ہی حرام ہے جیسے شراب پینا اور زنا کرنا حرام ہے۔ اس لئے اگر کبھی اپنے کسی کمال کا خیال آئے اور دوسرے شخص کے کسی نقص کا خیال آئے تو فوراً اس کا علاج اس طرح کرو کہ یہ سوچو کہ کیا معلوم اس کے اندر اور کوئی خوبیاں ہوں جو مجھے معلوم نہیں، کیا معلوم کہ میرے اندر ایسی برائیاں ہوں جو اس کی برائی سے زیادہ سنگین ہوں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ شخص کتنا مقبول ہو۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض لوگ

اور جو لوگ بظاہر دیکھنے میں بڑے باعزت اور باوقعت نظر آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک پرکاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان ابغضکم اِلیّ وأبعدکم منی مجلسا یوم القیامة الثرثارون والمتشدقون والمتفیھقون۔

(ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی معالی الاخلاق)

یعنی وہ لوگ جن سے مجھے نفرت ہے اور جو قیامت کے دن مجھ سے دور ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو زیادہ بولنے والے ہیں اور باچھیں چیر کر بات کرنے والے اور تکبر کرنے والے ہیں، یعنی جو مجلسیں گرم کرنے والے اور بڑے فصیح وبلیغ مشہور ہیں، جو شعلہ بیان اور آتش نوا مشہور ہیں، لوگ ان کے اردگرد جمع ہیں،

اور وہ لوگ باچھیں چیر چیر کر لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور وہ لوگ جو لوگوں سے اپنی فصاحت و بلاغت کالوہا منوائے ہوئے ہیں اور فصاحت و بلاغت اور حسن کلام کی وجہ سے لوگوں میں مقبولیت ہے، عام لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے عالم، بڑے فقیہ، بڑے واعظ ہیں، بڑے خطیب ہیں، بڑے باغ و بہار اور مجلسی ہیں، لیکن ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین ہیں۔ العیاذ باللہ۔

کسی پر کوئی حکم مت لگاؤ

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ تو ظاہری خوبیاں مقبولیت کے لئے معیار ہیں اور نہ ہی ظاہری نقائص اللہ تعالیٰ کے یہاں غیر مقبول ہونے کی علامت ہیں، کس بات پر انسان فیصلہ کرے؟ کس چیز پر حکم لگائے؟ اس لئے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور کسی بھی انسان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی حکم مت لگاؤ۔ نہ تو کسی کی تعریف کرو اور نہ کسی کی برائی کرو۔

کافر کو بھی حقیر مت سمجھو

انسان ابتداء میں جب دین پر چلنا شروع کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر جوش و خروش ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں ساری مخلوق پر لعنت ملامت شروع کر دیتا ہے، ساری مخلوق کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب جہنمی ہیں، بس میں ہی جنتی ہوں، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے مسلمان تو مسلمان، کسی کافر کو بھی

قطعی طور پر جہنمی مت کہو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسلام کی توفیق دیدے اور ایک لمحے میں اس کا بیڑہ پار ہو جائے۔

کافر پر "مخلّد فی النار" ہونے کا حکم مت لگاؤ

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور باریک بات ارشاد فرمائی جو سمجھنے کی ہے، فرمایا کہ اگر کسی شخص کے ظاہری اقوال سے ایسی باتیں صادر ہو رہی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچ رہی ہیں، تو مفتی کا کام یہ ہے کہ اس کے اوپر فتویٰ دیدے کہ یہ باتیں کفر کی ہیں اور دنیا میں اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا، بشرطیکہ مفتی نے پوری احتیاط سے کام لیا ہو وہ احتیاط یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے احتمالات کافر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال مسلمان ہونے کا ہو، تب بھی کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ لیکن اس کے بارے میں کفر کا فتویٰ دیے جانے کے باوجود یہ مت کہو کہ اس کی وجہ سے وہ "مخلّد فی النار" ہو گیا، اس لئے کہ بیشک ظاہری اعتبار سے اس کی بات کفر تھی، لیکن کیا معلوم کہ باطنی طور پر اسکے قول کی ایسی تاویل ہو جو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں کفر سے بری کر دے۔

ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ

اس کی مثال میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صحیح بخاری کی حدیث پیش فرماتے ہیں، جس میں پچھلی امّتوں کے ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ پچھلی

امتوں میں ایک شخص تھا، جب اس کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو آگ میں جلا دینا اور لاش جلنے کے بعد جب راکھ ہو جائے تو جس دن بہت تیز ہوا چل رہی ہو، اس دن اس راکھ کو ہوا میں اڑا دینا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ایسی وصیت کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں، اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، کیونکہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آگیا تو اللہ تعالیٰ مجھے سخت سزا دیں گے، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق عمل کر لیا گیا۔

جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شخص اولاً ہمارے وجود پر ایمان لایا، دوسرے یہ کہ یہ شخص ہم سے ڈر بھی گیا اور ایسا ڈرا کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے سخت عذاب دیں گے، اس کی ان باتوں کی وجہ سے ہم اس کی مغفرت کرتے ہیں۔

ظاہری کفر کے باوجود مغفرت کی وجہ

اب بظاہر تو اس کی یہ وصیت کفر تک پہنچتی ہے، اس لئے کہ اس نے کہا تھا کہ میں یہ وصیت اس لئے کر رہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے کہ اگر ہوا میں میرے جسم کی راکھ اڑا دی جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ مجھے جمع نہیں کر سکیں گے، یہ کھلا کفر ہے۔ لیکن چونکہ اس وصیت کا منشا اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف تھا، اس لئے

اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص سے ظاہراً کفر بھی صادر ہو گیا ہو، اس کے اوپر فتویٰ بھی کفر کا ہو گا، اس لئے کہ مفتی کا کام ہی یہ ہے کہ اس کے اوپر کفر کا حکم لگائے، لیکن اس کے "مخلّد فی النار" ہونے کا حکم نہ لگائے۔

"منصور حلّاج" پر کفر کا فتویٰ

دیکھئے! "منصور حلّاج" جن کا "انا الحق" کہنے کا واقعہ مشہور ہے، یہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بلکہ شاید ان کے خلیفہ بھی تھے، جب ان سے "انا الحق" کا کلمہ صادر ہوا جو ظاہراً کفر کا کلمہ تھا تو علماء نے ان کے اوپر کفر کا فتویٰ دیدیا، حالانکہ اندرونی طور پر وہ ہرگز کافر نہیں تھے، ان پر تو کفر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھیں، بلکہ غلبہ حال میں ان سے ایسا کلام صادر ہوا تھا اور اس کی تاویلیں موجود تھیں، لیکن چونکہ فتنہ پھیل رہا تھا، اس لئے علماء کرام نے کفر کا فتویٰ دیدیا۔

پھانسی کے وقت حضرت جنید بغدادیؒ سے گفتگو

جب ان کو پھانسی دینے کا وقت آیا تو بہت بڑی مخلوق ان کی پھانسی دینے کا نظارہ کرنے کے لئے آئی تھی، ان میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے، جب منصور حلّاج نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو ان سے کہا کہ یہ ساری مخلوق جو جمع ہے یہ تو حقیقت حال سے بے خبر ہے، ان کو

تو کچھ معلوم نہیں ہے، اس لئے میں ان کو معذور سمجھتا ہوں، لیکن اے جنید! آپ کو تو حقیقت کا پتہ ہے کہ میں کیا کہتا ہوں اور میری مراد کیا ہوتی ہے، اس لئے آپ کیوں آئے؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے خلاف جو فتویٰ دیا گیا ہے وہ صحیح ہے اور تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے۔ حالانکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ اندر سے منصور کی مراد کچھ اور ہے۔

علماء دین کے چوکیدار ہیں

لیکن اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبان اور فقہاء کو دین کا پاسبان بنایا ہے، ان کا فرض ہے کہ جو بات حق ہے وہ بتادیں، اگر کسی نے کفر کی بات کی ہے تو وہ کہدیں گے کہ یہ کفر ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں، جس کو چاہا کافر بنادیا اور جس کو چاہا مسلمان بنادیا، میں نے کہا ہم ٹھیکیدار تو نہیں ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین کا چوکیدار ضرور بنایا ہے، اور چوکیدار کا کام یہ ہے کہ وہ شناخت کے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دے، حتیٰ کہ اگر وزیر اعظم بھی آجائے گا تو اس کو بھی روک لے گا کہ پہلے شناختی کارڈ دکھاؤ اور اپنی شناخت کراؤ کہ آپ وزیر اعظم ہیں، تب اندر جانے دوں گا ورنہ اندر نہیں جانے دوں گا۔ حالانکہ وہ وزیر اعظم ہے اور یہ چوکیدار ہے، اسی طرح ہم بھی دین کے چوکیدار ہیں، لہٰذا اگر کوئی دین کے اندر داخل ہونا چاہے لیکن وہ ان صفات کا حامل نہ ہو تو ہمارا حق ہے کہ اس کو دین کے اندر داخل

ہونے سے روک دیں۔

کفر کے فتویٰ کے بعد جہنمی ہونے کا حکم مت لگاؤ

لہٰذا جو مفتیان کرام کسی شخص کے بارے میں صحیح طور پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن فتویٰ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے؟ وہ جنّت میں جائے گا یا جہنّم میں جائے گا؟ اگر وہ جہنّم میں جائے گا تو وہاں پر ہمیشہ رہے گا یا اللہ تعالیٰ اس کو کسی وقت جہنّم سے نکال دیں گے؟ یہ فیصلے ہم نہیں کر سکتے اور ان فیصلوں میں ہمیں پڑنا بھی نہیں چاہئے، کیا معلوم کہ ایک شخص ظاہری اعتبار سے کافر نظر آرہا ہے، لیکن اس کے پاس کوئی ایسی تاویل ہو جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس پر فضل کا معاملہ فرمادیں۔ اس لئے کسی بھی انسان کو کسی بھی لمحے حقیر سمجھنا تکبر کا حصّہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ١٩

خاص وضع اختیار کرنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
١٨٨/١- لیاقت آباد، کراچی ١٩

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۱۹

صفحات : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مجلس نمبر۱۹

خاص وضع اختیار کرنا تکبّر ہے

الحمد للّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبۃ للمتقین ۔
والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ الکریم ۔ وعلیٰ
آلہ واصحابہ اجمعین ۔ أَمَّا بَعْدُ!

وضعداری میں غلو بھی کبر ہے

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

وضع داری میں غلو بھی کبر ہے، وضع کیا چیز ہے؟ قطع کیا چیز ہے؟ اور آن کیا چیز ہے؟ یہ سب شیطانی دھندے ہیں، اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لئے خاص وضع مقرر ہو، بندہ کا حق تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے، اپنی رائے اور

ارادے کو بالکل فنا کردے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۷)

بعض لوگوں کا یہ مذاق ہوتا ہے کہ لوگوں میں اپنا امتیاز ظاہر کرنے کے لئے خاص وضع بنالیتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے اپنا خاص لباس مقرر کرلیا، اب جب ملاقات کریں گے تو اسی لباس میں، جب باہر نکلیں گے تو اسی لباس میں، اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنا ایک امتیاز پیدا ہو اور لوگوں میں یہ شہرت ہو جائے کہ یہ آدمی ہمیشہ یہ لباس پہنتا ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ بھی کبر کا ایک شعبہ ہے۔

خاص لباس کا اہتمام نہ کریں

دیکھئے! بغیر اہتمام کے کوئی خاص لباس آدمی پہنتا رہے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن یہ اہتمام کہ جب بھی کپڑے پہنوں تو ایسا ہی لباس ہو، دوسرا نہ ہو، ٹوپی جب بھی پہنوں تو ایسی ہو، میرا حلیہ ہمیشہ ایسا ہی ہو، وضع کے اس اہتمام کا منشا بسا اوقات کبر ہوتا ہے اور یہ منشا ہوتا ہے کہ میں اوروں سے ممتاز نظر آؤں۔ ارے بھائی! کہاں کا امتیاز؟ کہاں کی وضع قطع؟ ہونا یہ چاہئے کہ!

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

کونسی صورت کبر میں داخل ہے؟

اسی لئے ہمارے بزرگوں نے کسی خاص لباس کا اہتمام نہیں فرمایا، بلکہ

کبھی کچھ پہن لیا، کبھی کچھ پہن لیا، تاکہ یہ کبر میں شامل نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی خاص لباس کا اہتمام کرنا ہمیشہ کبر ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو کسی خاص اہتمام کے بغیر ایک لباس پہننے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور وہ پہنتا چلا جارہا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن ایسا کرنا کہ اس کے خلاف ہی نہ ہو اور اس کے خلاف ہونے کو اپنی توہین سمجھے تو یہ صورت کبر کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بے تکلّف رہو، کسی خاص لباس پہننے کا تکلّف نہ کرو، بلکہ اگر بے تکلّفی میں ایک لباس پہن رہے ہو تو پہنتے رہو، بے تکلّفی میں دوسرا لباس مل گیا تو وہ پہن لیا تو کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا ایک لباس کا اہتمام کرنا یہ تکبر میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سادہ لباس پہنتے تھے، مگر وہ لباس قاعدہ کا ہوتا تھا، اور آپ خوش پوش تھے اور عام طور پر سفید لباس پہنتے تھے۔ حضرت والا کی بڑی اہلیہ حضرت سے بہت محبت کرتی تھیں، ایک مرتبہ رمضان المبارک میں انہوں نے حضرت والا کے لئے ایک اچکن سیا، چونکہ شوقین تھیں، اس لئے انہوں نے اچکن کے لئے بہت شوخ قسم کے کپڑے کا انتخاب کیا جس پر پھول بوٹے بھی بنے ہوئے تھے، پورے رمضان اس کو خود سیتی رہیں اور حضرت والا کو خبر بھی نہ ہونے دی، بس عید سے ذرا پہلے

اس کو تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ یہ اچکن میں نے آپ کے لئے سیا ہے، حضرت والا دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ ایسا شوخ کپڑا تو میں نے آج تک کبھی نہیں پہنا، لیکن حضرت والا نے ان پر کچھ ظاہر نہیں کیا، بلکہ ان کی تعریف کی کہ تم نے تو ماشاءاللہ بہت اچھا سیا ہے اور بڑی محنت سے سیا ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ اہلیہ نے کہا کہ میں نے یہ اس لئے سیا ہے کہ آپ اس کو پہن کر عید گاہ جائیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے سوچا کہ اب اس کو پہن کر عید گاہ جاؤں تو مشکل، نہ پہنوں تو مشکل، اگر پہن کر جاؤں تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ مولانا صاحب کو دیکھئے کیسا شوخ لباس پہن کر عید گاہ میں آگئے، اور اگر نہ پہنوں تو ان کا دل ٹوٹے گا، اس لئے کہ انہوں نے سارا رمضان بڑی محنت سے اس کو سیا ہے۔ آخر میں حضرت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کا دل توڑنا مناسب نہیں، اگر میں اس کو پہن کر عید گاہ جاؤں گا اور لوگ برا سمجھیں گے تو سمجھتے رہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ لوگ باتیں کریں گے کہ مولانا صاحب کیسا شوخ لباس پہن کر آگئے، چلو کہنے دو۔

چنانچہ آپ اس کو پہن کر عید گاہ تشریف لے گئے، جب عید کی نماز سے فارغ ہوئے تو ایک صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ اچکن تو آپ پر زیب نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا: ہاں بھائی! تم صحیح کہتے ہو، اچھا ایسا کرو کہ تم ہی اس کو لے جاؤ، چنانچہ وہ اتار کر اس کو دیدیا۔

عبدیت کا پیکر تھے

اب آپ اندازہ لگائیں کہ اتنے بڑے آدمی کو اپنی طبیعت کے خلاف لباس پہن کر اتنے بڑے مجمع میں جانا پڑ جائے تو اس پر کیا گزرے گی؟ لیکن آپ نے دل شکنی سے بچنے کے لئے یہ سب گوارہ کر لیا۔ اگر کوئی ہم جیسا وضع قطع کا پابند ہوتا تو وہ اپنی اہلیہ کو یہ جواب دیتا کہ تمہاری محنت اکارت جائے، میں تو یہ پہن کر نہیں جاؤں گا، میں لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو جاؤں گا، لیکن چونکہ آپ نے اپنے نفس کو اللہ کے لئے مٹایا ہوا تھا اور اپنے آپ کو فنا کیا ہوا تھا اور عبدیت کا پیکر بنایا ہوا تھا، اس لئے ان کے نزدیک عام کپڑا پہننا اور شوخ لباس پہننا سب برابر تھا۔ بہر حال! کسی بھی خاص وضع پر آدمی کو نہ تو اتنا اہتمام ہو اور نہ اصرار ہو کہ آدمی اس وضع کا غلام بن جائے۔

تکبر کا علمی علاج

حضرت نے تکبر کا علمی علاج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

تکبر کا علمی علاج تو یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے تو اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسرے کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص معیوب یقینی ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے، اس لئے مجھے اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا چاہئے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۸)

انسان کو اپنے عیوب کا تو سو فیصد یقین کے ساتھ علم ہے، اس میں تو کوئی شبہ نہیں، دوسرے کے عیب کے بارے میں جو علم ہو گا، وہ ظنّی ہو گا، اگرچہ ظن غالب ہی سہی۔ اب یہ دیکھیں کہ معیوب یقینی بدتر ہے یا معیوب ظنی؟ ظاہر ہے کہ معیوب یقینی بدتر ہے، اس لئے متکبر اپنے بارے میں یہ سوچے کہ میں معیوب یقینی ہوں، لہٰذا میں اس سے بدتر ہوا، اس لئے مجھے اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھنا چاہئے۔ یہ تو ہے علمی علاج۔

تکبّر کا عملی علاج

اور عملی علاج یہ ہے کہ جس کو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو، اس کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ۔ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے، اس کے بغیر تنہا علمی علاج کافی نہیں، تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب تک عملی علاج نہ کیا جائے گا تکبر دور نہ ہو گا۔

(ایضاً)

آپ کے دل میں دوسرے شخص کی ناقدری ہے، جس کی وجہ سے اس کو تم کمتر سمجھ رہے ہو، لہٰذا اب تم **بتکلّف** اس کے ساتھ تعظیم و تکریم کا معاملہ کرو، اس سے تکبر دور ہو گا۔ ایک صاحب کے خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو لکھا کہ تم مسافروں کے پیر دبایا کرو، اس سے تمہارا تکبر زائل ہو گا۔

بزرگوں کی مختلف ادائیں

ہمارے بزرگوں کی ادائیں بھی عجیب تھیں اور ان کے رنگ بھی مختلف تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش پوشاک تھے، صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنتے تھے، بقول شخصے کہ: حضرت تو دولہا بنے رہتے تھے۔ جبکہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر فنائیت کا رنگ غالب تھا، وہ کپڑوں کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا کرتے تھے، کبھی دوپلی پہن لی، کبھی پاجامہ پہن لیا، کبھی تہبند باندھ لیا، یہاں تک کہ کوئی آپ کو پہچان نہیں سکتا تھا کہ آپ شیخ الہند ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی تواضع

رمضان المبارک میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ساری رات تراویح پڑھنے کا معمول تھا، بیس رکعت تراویح میں ساری رات گزارتے تھے، دس پارے روزانہ پڑھے جاتے اور ہر تیسرے دن قرآن شریف ختم ہوتا تھا، مختلف حفاظ تراویح میں سنایا کرتے تھے، ان حفاظ میں ایک حافظ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، حضرت والا کو ان کی تلاوت بہت پسند تھی، اس لئے اکثر ان کو کھڑا کر دیا کرتے تھے۔

ایک دن مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت خراب ہو گئی، اس لئے انہوں نے معذرت کر دی کہ آج میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے

تراویح نہیں پڑھا سکوں گا، اس روز تراویح مختصر ہوئی اور تراویح کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے نفلیں پڑھنی شروع کردیں۔ مولانا فخر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ مسجد کے ساتھ ایک حجرہ تھا، میں اس میں جا کر لیٹ گیا، رات کو میں نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی میری ٹانگیں دبا رہا ہے، میں نے سوچا کہ شاید کسی طالب علم کو خیال آگیا ہوگا کہ یہ بیمار ہے، چلو ان کی ٹانگیں دبا کر ان کی کچھ خدمت کرلیں، اور مجھے ٹانگیں دبوانا اچھا لگا، اس لئے میں چپ چاپ لیٹا رہا اور مڑ کر نہیں دیکھا کہ کون دبا رہا ہے، جب کچھ دیر گزر گئی تو میں نے مڑ کر دیکھا کہ کون ہے، تو دیکھا کہ پاؤں دبانے والے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کو دیکھ کر میرے اوپر بجلی سی گری اور میں نے کہا کہ حضرت! یہ کیا؟ فرمایا کہ اس میں کیا حرج ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، میں نے سوچا کہ ذرا ٹانگیں دبا دوں، اس سے تمہیں آرام آجائے گا۔ حالانکہ مولانا فخر الدین صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔

یہ دارالعلوم دیوبند ویسے ہی مشہور نہیں ہوگیا، اور یہ اکابر دیوبند ویسے ہی "اکابر دیوبند" نہیں بن گئے، بلکہ انہوں نے صحابہ کے زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں، آج لوگ "مسلک دیوبند" کا مطلب ہی نہیں سمجھتے کہ "مسلک دیوبند" کیا ہے؟

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور تواضع

"ارواح ثلاثہ" میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہمارے

سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں سے علاج کے خاطر ان سے کہتے کہ جوتے اٹھاؤ، لیکن جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ وہ متواضع ہے اور اس کے اندر تکبر نہیں ہے تو اس طالب علم کے جوتے خود اٹھالیتے۔

ایک مرتبہ سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی تو طلبہ اپنی اپنی کتابیں اٹھا کر اندر جانے لگے تو حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے گئے۔ بے نفسی اور تواضع میں ان حضرات نے صحابہ کرامؓ کی یادیں تازہ کر دی تھیں اور اپنے آپ کو مٹایا ہوا تھا۔

ہمارے دماغوں میں کبر کا، علم کا، دولت کا، صحت کا، اوصاف میں کمال کا جو خنّاس بھرا ہوا ہے اس نے سارا معاملہ خراب کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ خنّاس ہمارے اندر سے نکال دے۔ آمین۔

اتحاد قائم نہ ہونے کی وجہ تکبر ہے

آج ہمارے اندر اتفاق اور اتحاد قائم نہیں ہوتا، جبکہ ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ اتحاد ہو جائے لیکن اتحاد ہو کر نہیں دیتا، اور اگر اتحاد ہو بھی جاتا ہے تو چند روز کے بعد ہی چوراہے پر ہنڈیا پھوٹ جاتی ہے اور سارا اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اتحاد قائم ہونے کی دو شرطیں ہیں، جب تک یہ دونوں شرطیں نہیں پائی جائیں گی، اس وقت تک اتحاد قائم نہیں ہو سکتا،

ایک اخلاص، دوسرے تواضع، لہٰذا دو متکبروں میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا، اگر اتحاد ہوگا تو وہ وقتی ہوگا اور ذاتی مفادات کے لئے ہوگا، جب وہ مفادات پورے ہو جائیں گے، بس پھر اتحاد ختم ہو جائے گا۔

دو متکبّروں میں اتحاد کی مثال

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دو متکبروں کے درمیان جو ذاتی مفادات کے لئے اتحاد قائم ہوتا ہے، اس کی مثال "گدھا کھجاور" جیسی ہے، جب گدھے کی کمر میں خارش ہوتی ہے تو وہ خود سے تو اپنا جسم کھجا نہیں سکتا، اس لئے وہ دوسرے گدھے سے کہتا ہے کہ تیری کمر میں بھی کھجال ہو رہی ہے اور میری کمر میں بھی کھجال ہو رہی ہے، اس لئے تو میرے قریب آجا، پھر ہم دونوں آپس میں مل کر کمر سے کمر رگڑتے ہیں، اس کو "گدھا کھجاور" کہتے ہیں۔ اسی طرح دو متکبروں کے درمیان اتحاد بھی درحقیقت "گدھا کھجاور" ہے، اس لئے کہ یہ اپنی ذاتی اور وقتی مفاد کی خاطر اتحاد کر لیتے ہیں، جب اپنا مفاد پورا ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کو لات مار کر الگ ہو جاتے ہیں، اور حقیقی اتحاد اخلاص اور تواضع کے بغیر قائم ہو ہی نہیں سکتا، اور سارے جھگڑوں کی بنیاد بھی یہی تکبّر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے نجات عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❁❁❁

مجلس نمبر ۲۰

چھوٹے پر زیادتی کی معافی مانگنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۰

صفحات : ۱۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۰

چھوٹے پر زیادتی کی صورت میں معافی کا طریقہ

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ والعاقبۃ للمتقین۔ والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ الکریم۔ وعلیٰ آلہ واصحابہٖ اجمعین۔ أمّا بَعۡدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ میں (اپنے سے چھوٹے سے) معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہو کر زیادہ نافرمانی کرے گا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم معافی مانگیں گے تو یہ شرمندہ ہوگا، مگر یہ عذر اس وقت ہیں جب اس سے تعلق رکھنا چاہیں، توان صورتوں

میں صرف اس کو خوش کر دینا امید ہے کہ معافی کے قائم مقام ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات اس سے (آئندہ) تعلق ہی نہیں رکھنا، جیسے ملازم کو موقوف کر دیا، یا ملازم خود (ملازمت) چھوڑ کر جانے لگا، تو اس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہو جانے کی صورت میں اس سے صریح معافی مانگی جائے، کیونکہ یہاں وہ دونوں عذر موجود نہیں، اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب ضرور "کبر" ہے، گو اپنے کو بڑا نہ سمجھے، مگر کبر کے مقتضیٰ پر عمل تو ہوا، غایت سے غایت (زیادہ سے زیادہ) کبر اعتقادی نہ ہو گا، مگر کبر عملی تو ضرور ہے، اگر کوئی (شخص) کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تب بھی ظلم تو ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے، لہٰذا معافی نہ مانگنے میں اگر کبر کا گناہ نہ ہوا تو ظلم کا (گناہ) تو ہوا۔

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۵۸)

چھوٹے پر زیادتی ہو جاتی ہے

یہ مسئلہ اکثر لوگوں کو بکثرت پیش آتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص افسر ہے اور لوگ اس کے ماتحت کام کرتے ہیں، اس کو یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح استاد کو اپنے

شاگردوں کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح شیخ کو اپنے مریدوں کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات اپنے ماتحت کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے شاگرد کو یا اپنے مرید کو کسی غلطی پر تنبیہ کرنے میں زیادتی ہو جاتی ہے، جتنی تنبیہ کرنی چاہئے تھی اس سے زیادہ کر دی، یا جتنا اس کو ڈانٹنا چاہئے تھا اس سے زیادہ ڈانٹ دیا، یا جتنی سزا دینی چاہئے تھی اس سے زیادہ دیدی، یا سزا کا موقع نہیں تھا، لیکن اس کو غلط سزا دیدی۔ اس طرح کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں۔

معافی مانگنے کا نقصان

اب سیدھی بات تو یہ ہے کہ جس کے ساتھ تم نے زیادتی کی ہے، اس سے معافی مانگ لو کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے، مجھے معاف کر دو۔ لیکن بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں اس طرح صریح الفاظ میں اس سے معافی مانگوں گا تو اس کے اندر اور زیادہ نافرمانی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا، یہ اور گستاخ ہو جائے گا اور غلط راستے پر چل پڑے گا۔

آدمی آدمی میں فرق

دیکھئے! آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کوئی آدمی تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس سے کوئی بڑا آدمی جھک کر بات کرلے اور دب کر بات کرلے تو پانی پانی ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لئے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ کسی بڑے نے جھک کر بات

کرلی یادب کر بات کرلی تو وہ اور شیر ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں وہ اور زیادہ سر کشی پر اتر آتے ہیں۔ "متنبی" شاعر بعض اوقات بڑی حکیمانہ باتیں کہتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:

إِذَا اَنْتَ اَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَه‘

وَاِنْ اَنْتَ اَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم کسی شریف آدمی کی عزت کرو گے اور اس کا اکرام کرو گے تو وہ تمہارا غلام بن جائے گا اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے، اور اگر تم کسی کمینے کے ساتھ عزت کا معاملہ کرو گے تو وہ سرکش ہو جائے گا۔ آگے کہتا ہے:

وَضْعُ النَّدٰى فِيْ مَوْضَعِ السَّيْفِ بِالْعُلٰى

مُضِرٌّ كَوَضْعِ السَّيْفِ فِيْ مَوْضَعِ النَّدٰى

یعنی جس جگہ تلوار استعمال کرنی چاہئے تھی، اگر تم نے وہاں سخاوت کا برتاؤ کیا تو یہ بھی اتنا ہی مضر ہے جتنا کہ سخاوت کے موقع پر تلوار کا استعمال مضر ہے۔ بہر حال، آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کسی آدمی کے ساتھ اگر آپ تواضع سے پیش آئیں تو وہ بچھ جائے گا اور پھر کبھی بھی سرکشی پر آمادہ نہیں ہوگا، اور بعض وہ ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ تو وہ الٹا سرکش بن جاتے ہیں۔

اس لئے بعض اوقات دل میں خیال آتا ہے کہ اگر میں اپنے سے چھوٹے سے معافی مانگوں گا تو وہ سرکش ہو جائے گا اور زیادہ نافرمانی پر اتر آئے گا، اس کے

دماغ میں اور زیادہ خنّاس پیدا ہو جائے گا۔

دو میں سے ایک بات کا فیصلہ کرلو

ایسی صورت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ پہلے دو باتوں میں سے ایک بات کا فیصلہ کرلو، وہ یہ کہ جس چھوٹے کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، آئندہ اس سے تعلق باقی رکھنا ہے یا نہیں؟ مثلاً اپنے کسی نوکر کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آگیا، تو پہلے یہ فیصلہ کرو کہ آئندہ اس کو اپنے پاس بطور ملازم کے رکھنا ہے یا اس کو ملازمت سے علیحدہ کرنا ہے۔

اس کے ساتھ حسن سلوک کرلو

اگر اس کو ملازمت پر برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں نوکر سے صریح الفاظ میں معافی مانگنے کے بجائے کسی اور عنوان سے اس کی دلداری کر دی جائے، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ یا تحفہ دیدیا، یا اس سے ہنسی مذاق کی میٹھی بات کرلی، یا اس کی دعوت کر دی، تاکہ اس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھے کہ میرے ساتھ حسن سلوک کیا گیا ہے، ایسا حسن سلوک کر کے سابقہ زیادتی کی تلافی کرلی جائے۔

ورنہ معافی مانگ لو

اور اگر یہ ارادہ ہے کہ اب اس کو ملازمت پر نہیں رکھنا، بلکہ اس کی ملازمت سے چھٹی کرنی ہے اور اب اس کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھنا، تو اس صورت میں چونکہ گستاخ یا سرکش ہو جانے کا اندیشہ فضول اور بے کار ہے، اس

لئے اس صورت میں صراحتاً اس نوکر سے معافی مانگنی چاہئے۔ چنانچہ جب اس ملازم کو رخصت کرو تو اس سے صاف صاف کہدو کہ جو ہم سے زیادتی ہوئی ہو وہ ہمیں معاف کردو، اور خاص طور پر اس زیادتی کا بھی ذکر کردو کہ فلاں وقت میں مجھ سے زیادتی ہوئی تھی اور مجھ سے غلطی ہوئی تھی، مجھے معاف کردو۔

یہ تکبر کی بیماری کا علاج ہے

جب تم اپنے ملازم سے یہ کہو گے کہ فلاں وقت مجھ سے جو زیادتی ہوئی تھی، مجھے معاف کردو۔ ان الفاظ کو زبان سے نکالتے وقت متکبر کے دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن تکبر کا علاج ہی یہ ہے کہ ملازم کو رخصت کرتے وقت صریح الفاظ میں اس سے یہ الفاظ کہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب صریح لفظوں میں معافی ہو جائے گی تو پھر انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ نہیں ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحت کو ناحق سزا دی تھی یا ناحق ڈانٹا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تکبر کی بیماری کا علاج ہو جائے گا۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

اس کائنات میں کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور منصب کے برابر ہو سکتا ہے؟ بلکہ دنیا و آخرت میں کوئی منصب، کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی حیثیت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور عہدہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجمع عام میں

کھڑے ہو کر اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی سے معاملہ کرتے وقت مجھ سے کوئی زیادتی ہو گئی ہو یا میں نے کسی کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزّت اور آبرو پر کوئی زیادتی کی ہو تو آج میں یہاں سب کے سامنے موجود ہوں، اگر وہ چاہے تو مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینا

ایک صحابیؓ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلہ لینا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کس چیز کا بدلہ لینا ہے؟ ان صحابیؓ نے عرض کیا کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کمر پر مارا تھا، اس کا بدلہ لینا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میں نے کسی کو مارا ہو، لیکن اگر تمہیں مارنا یاد ہو تو بدلہ لے لو، ان صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر ننگی تھی، میری کمر پر کوئی کپڑا نہیں تھا، برابر بدلہ تو اس وقت ہو گا جب آپ کی کمر پر بھی کپڑا نہ ہو، اس وقت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر پر چادر ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کمر سے چادر ہٹالی اور فرمایا کہ اب بدلہ لے لو۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر مبارک سے چادر ہٹائی تو مہر نبوت نظر آنے لگی۔ وہ صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت کی طرف گئے اور مہر نبوت کو جا کر بوسہ دیا اور کہا کہ میرا مقصد تو مہر نبوت کا بوسہ لینا تھا، بدلہ لینا میرا مقصود نہیں تھا۔ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر

کسی کے ساتھ میں نے زیادتی کی ہے تو وہ بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے تو ہما شما کس شمار و قطار میں ہیں۔

بہر حال! انسان یہ کہتے ہوئے کیوں شرمائے کہ میری غلطی پر مجھے معاف کر دو۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اس ملازم اور نوکر سے تعلق نہیں رکھنا تو صاف صاف الفاظ میں اس سے معافی مانگ لو اور معافی مانگنے میں کبھی شرم کو آڑے نہ آنے دو۔

معافی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے معافی مانگ لو

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے ذمے دوسرے کا کوئی جانی یا مالی حق ہو، وہ آج اس شخص سے معاف کرالے جس کا حق ہے، قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے کہ معافی کا دروازہ بند ہو جائے۔ آج تو تم اس کی خوشامد کر کے معاف کرالو گے یا کوئی معاوضہ دے کر معاف کرالو گے، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب تمہارے پاس اس کو پیش کرنے کے لئے نہ دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، آخرت میں تو وہاں کی کرنسی استعمال ہوگی اور وہاں کی کرنسی نیکیاں ہیں، وہاں پر تو حق کی معافی کے لئے یا تو اپنی نیکیاں اس کو دینی پڑیں گی یا اس کے گناہ اپنے اوپر لینے پڑیں گے، اس کے حق کو ادا کرنے کا اور اس کے وبال سے بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ وقت آنے سے پہلے پہلے معاف کرالو۔

حضرت تھانوی کا معافی مانگنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی مانگنے کی سنت پر عمل کرتے ہوئے وفات سے چند سال پہلے ایک رسالہ لکھا تھا، اس رسالے کا نام تھا "العذر والنذر" اس رسالے میں لکھا تھا کہ ساری عمر میرا جن لوگوں سے تعلق رہا، نہ جانے مجھ سے کس کی کیا کیا حق تلفی ہوئی ہو، میں آج ان حقوق کی ادائیگی کے لئے تیار ہوں، اگر کسی کا مالی حق میرے ذمے ہے اور مجھے ادا کرنا یاد نہیں رہا تو مجھے یاد دلا کر وہ حق وصول کر لے، اور اگر کسی کا جانی حق ہے تو اگر وہ مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے تو بدلہ لے لے، معاف کرنا چاہتا ہے تو معاف کر دے، میں آپ سب سے معافی کا طلب گار ہوں۔ پھر یہ رسالہ خط کی شکل میں اپنے سارے متعلقین کو بھیجا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا معافی مانگنا

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وفات سے تقریباً دو سال پہلے معافی کا ایک مضمون مجھ سے لکھوایا اور پھر اس کو "کچھ تلافی مافات" کے نام سے "البلاغ" میں بھی شائع کیا اور فرداً فرداً بھی اپنے متعلقین کے پاس بھیجا اور اس کے ذریعہ اپنے تمام متعلقین سے معافی مانگی۔

لہٰذا یہ معافی مانگ لینا ہیٹی کی بات نہیں، اس سے انسان کی عزت میں کمی

نہیں آتی، بلکہ اس کے ذریعہ انسان آخرت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تکبّر کا خاتمہ ہو تا ہے۔

ہدیہ دیکر نوکر کو خوش کر دو

اور اگر اس ملازم اور نوکر سے آئندہ تعلق باقی رکھنا ہے تو اس صورت میں صراحتًا اس سے معافی مانگنے کی صورت میں اگر اس کے سرکش ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ کسی عنوان سے اس کی دلداری کرلو، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ دیدو یا کوئی تحفہ دیدو اور اس کا دل خوش کر دو۔

نوکر اور ماتحت کے بارے میں اتنی تاکید کیوں؟

"نوکر" اور "ماتحت" ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، ورنہ اکثر و بیشتر انسان اپنے ماتحتوں کے معاملے میں انصاف سے تجاوز کر جاتا ہے، اس لئے کہ وہ ماتحت اپنی گرفت اور اپنے پنجے میں ہو تا ہے، ہم جب چاہیں اس کو ڈانٹ سکتے ہیں، جب چاہیں اس کی خبر لے سکتے ہیں، تو چونکہ ماتحت پر انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ اس قدرت کو حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے اور اس قدرت کو غلط استعمال کر جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اب ظاہر ہے کہ کسی واقعی غلطی پر ہی سزا دے رہے ہوں گے، بلاوجہ تو سزا نہیں دے رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مارتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا:

لَلّٰهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ

یعنی جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ قدرت تم پر حاصل ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ذرا اس بات کا دھیان کرو کہ اس قدرت کو صحیح اور برمحل اور مناسب حدود میں استعمال کر رہے ہو یا نہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر قدرت کا مظاہرہ کرنے پر آجائیں تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا معمول

بہر حال! ان چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکبر کے بڑے امکانات ہیں، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہئے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب میں کبھی اپنے کسی چھوٹے سے مؤاخذہ کرتا ہوں اور اس کو ڈانٹنے کی نوبت آجاتی ہے تو الحمد للہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی کہ ایک طرف تو اس کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور دوسری طرف دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے

ایسا مؤاخذہ نہ فرمائیے گا۔ اب بتائیے جس شخص کے دل میں ہر وقت آخرت کی یہ فکر لگی ہوئی ہو، وہ کیسے حد سے تجاوز کرے گا۔

بھائی نیاز کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ: حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، جن کا نام "بھائی نیاز" تھا، وہ حضرت کے بہت قریب رہتے تھے، اس وجہ سے ذرا منہ چڑھے خادم تھے، اور جو کسی بڑے کا منہ چڑھا ہوتا ہے وہ دوسروں پر ناز بھی کیا کرتا ہے، بقول کسی کے:

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

شاہ کا مصاحب دوسروں پر ناز کرتا ہے۔ اس لئے حضرت والا کے پاس جو آنے جانے والے مہمان ہوتے، بعض اوقات ان کے ساتھ نامناسب انداز میں پیش آتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع ہو گئی کہ یہ بھائی نیاز آنے جانے والوں کے ساتھ درشتی کا معاملہ کرتے ہیں، حضرت نے ان کو بلایا اور سخت لفظوں میں ان سے کہا: میاں نیاز! تم آنے والوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے ہو اور ان کے ساتھ بے تہذیبی سے بات کرتے ہو۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ: حضرت! جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔ دیکھئے کہ ایک نوکر اور خادم اپنے آقا سے کہہ رہا ہے کہ "جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو" اب اس وقت تو اور زیادہ اس نوکر کو ڈانٹنا چاہئے تھا لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ "استغفر اللہ"

''استغفر اللہ'' کہتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

میں نے یک طرفہ بات سن کر ڈانٹا

بعد میں لوگوں کے سوال کرنے پر حضرت والا نے بتایا کہ جب بھائی نیاز نے مجھ سے کہا کہ ''جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو'' اس وقت مجھے تنبہ ہوا کہ میں نے یک طرفہ بیان سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا، ابھی میں نے صرف لوگوں کی بات سنی تھی کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے، مجھے یہ چاہئے تھا کہ میں ان کا بیان بھی سنتا اور ان سے پوچھتا کہ لوگ تمہارے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، بتاؤ! یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ ان کے بیان کو سننے کے بعد ڈانٹنے کا فیصلہ کرتا، لیکن میں نے یک طرفہ بات پر ڈانٹنا شروع کر دیا، اس وجہ سے مجھ سے غلطی ہوئی، اس لئے میں استغفار کرتا ہوا چلا گیا۔

بھائی نیاز کے قول کا مطلب

حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ بھائی نیاز کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ سے شکایت لگائی ہے ان کو چاہئے کہ وہ جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں۔ لیکن جلدی میں زبان سے براہ راست حضرت والا سے خطاب کرتے ہوئے کہدیا کہ جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔

اللہ کی حدود کے آگے رک جانے والے

لیکن اس واقعہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب ایک خادم کو ڈانٹا تو فوراً اس وقت ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے یک طرفہ بیان پر فیصلہ کر دیا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی، لہٰذا اس پر استغفار کرتے ہوئے چلے گئے۔ اس کو کہا جاتا ہے کہ:

كَانَ وَقَّافاً عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ

یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے تھے۔ یہ تھے "حکیم الامّت" ویسی ہی "حکیم الامّت" نہیں بن جاتے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا فیض چار دانگ عالم میں پھیلایا۔ آج ہم نے چند ظاہری رسوم کا نام "دین" رکھ لیا ہے، حالانکہ یہ بھی سب دین کا حصّہ ہے کہ کس وقت کس سے کیا معاملہ کیا جائے اور کس حد میں کیا کیا جائے؟ یہ ترازو اپنے میں لگانی پڑتی ہے کہ کہیں ایک طرف پلّہ جھکے نہیں، بلکہ توازن کے ساتھ سارے کام انجام پائیں۔

بدلہ میں برابری آسان نہیں

بہر حال! چھوٹوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:

دو گونہ رنج و عذاب جانِ مجنون را

ایک طرف اس کا خیال رکھنا ہے کہ ہماری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے اور اگر کوئی زیادتی ہو تو اس کی معافی تلافی ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ وہ

سرکش نہ بنے، انتظام خراب نہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان توازن رکھنا بس یہی حدود اللہ کو قائم کرنا ہے۔ اور یہ کام عموماً کسی شیخ کی صحبت اور تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے بغیر آدمی پھسل جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی کی باقاعدہ تربیت ہوئی ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ کس جگہ پر کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے اور کتنا اختیار کرنا ہے، اگر کسی کو ڈانٹنا بھی ہے تو کتنا ڈوز دینا ہے، اور اس سے زیادہ دینے میں کس طرح زیادتی ہو جائے گی۔ یہ ترازو ویسے ہی دل میں پیدا نہیں ہو جاتی، اگر میں اس کو دو اور دو چار کر کے لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بیان نہیں کر سکتا، بلکہ یہ ایک ذوق اور ملکہ ہے، وہ ذوق اور ملکہ جب دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ اس جگہ اتنے ڈوز کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اس سے زیادہ کرو گے تو زیادتی ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا کہ:

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۹۴)

یعنی جتنی زیادتی کسی نے تم پر کی ہے، تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کر سکتے ہو۔ اس آیت پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے، کیونکہ جانچ تول کر یہ کرنا کہ میں اتنا بدلہ لوں جتنا اس نے کیا ہے، یہ آسان کام نہیں۔

اولیاءؒ کے مختلف الوان ہوتے ہیں

''ارواح ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ اولیاء اللہ

کے مختلف الوان ہوتے ہیں اور ان کی مختلف شانیں ہوتی ہیں، لہٰذا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا مختلف الوان ہوتے ہیں اور کیا شانیں ہوتی ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ تم اسی چکر میں مت پڑو، اپنے کرنے کا جو کام ہے وہ کئے جاؤ، ان صاحب نے اصرار کیا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں میں ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول نظر آئیں گے، تم جاکر تینوں کو پیچھے سے ایک ایک مکّہ مار دینا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا کرتے ہیں، جو وہ کریں مجھے آکر بتانا۔ چنانچہ وہ صاحب گاؤں کی مسجد میں گئے، جاکر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول تھے، اس نے جاکر پہلے ایک کو پیچھے سے مکہ مارا، ان صاحب نے پیچھے مڑکر ان کو بھی ایک مکہ اتنی زور کا مارا اور پھر ذکر اللہ میں مشغول ہوگئے۔ دوسرے کو جاکر مکّہ مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ جب تیسرے شخص کو مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ دبانا شروع کر دیا کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

جب یہ صاحب واپس ہوئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے ساری تفصیل بتادی کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا، ان بزرگ نے فرمایا کہ تم بزرگوں کے الوان جاننا چاہ رہے تھے، یہ مختلف الوان تھے، پہلے بزرگ جنہوں نے تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنی ہی زور کا مکہ مارا جتنی زور کا تم نے مارا تھا، یا زیادہ زور کا مارا؟ ان صاحب نے کہا کہ نہیں، اتنی ہی زور کا مارا تھا،

فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ جتنی زیادتی اس نے میرے ساتھ کی، میں نے بھی اتنا ہی بدلہ لے لیا۔

پہلے بزرگ نے بدلہ کیوں لیا

لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اللہ کے ولی لوگوں سے بدلہ اس لئے لیتے ہیں تاکہ یہ شخص آخرت کے مؤاخذہ سے بری ہو جائے، اس لئے بدلہ نہیں لیتے کہ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، بلکہ اس لئے بدلہ لیتے ہیں کہ اگر میں اس سے یہاں بدلہ لے لونگا تو یہ آخرت کے مؤاخذہ سے بری ہو جائے گا، اسی لئے ان بزرگ نے بدلہ لیا، لیکن اتنا ہی لیا جتنا لینا چاہئے تھا، اس سے زیادہ نہیں لیا۔

دوسرے بزرگ نے بدلہ کیوں نہیں لیا

دوسرے بزرگ جو تھے انہوں نے سوچا کہ بدلہ لینے کے چکر میں کون پڑے، کیونکہ اگر ایک انچ بھی زیادہ بدلہ لے لیا تو الٹی اپنی گردن پکڑی جائے گی، کیوں خواہ مخواہ اس چکر میں پڑوں اور جس کام میں لگا ہوا ہوں، اس سے اپنا وقت ضائع کروں، اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہوں، اسی میں لگا رہوں، کوئی اگر مارتا ہے تو مارتا رہے۔

تیسرے بزرگ کا عمل

تیسرے بزرگ نے اپنے آپ کو اتنا مٹایا ہوا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ان کو

اپنی چوٹ کی پروا نہ ہوئی، بلکہ الٹا مارنے والے کے ہاتھ دبانے لگے کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔ بہر حال! بزرگوں کے یہ مختلف رنگ اور مختلف طریقے تھے، اور تینوں طریقے جائز تھے، پہلا طریقہ بھی جائز تھا، اس لئے کہ برابر کا بدلہ لینا جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا۔

(سورۃ الشوریٰ، آیت ۴۰)

اور دوسرا طریقہ یعنی معاف کرنا بھی جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

(سورۃ الشوریٰ، آیت ۴۳)

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت بھی یہی تھی کہ معاف فرمادیا کرتے تھے، اپنی ذات کے لئے کبھی بدلہ نہیں لیا۔ اور تیسرا طریقہ اس سے زیادہ افضل اور اعلیٰ تھا کہ اپنی فکر کے بجائے مارنے والے کی فکر کر رہے تھے۔

خلاصہ

بہر حال! بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس میں ہر وقت انسان کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں مجھ سے زیادتی نہ ہو جائے۔ آج لوگ کس بے دردی سے اور بے محابا انسانوں کے حقوق پر، ان کی جان پر، ان کے مال پر، ان کی آبرو پر ڈاکے ڈالتے ہیں، وہ جان مال آبرو جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی جان اور مال اور آبرو بیت اللہ سے زیادہ

حرمت والی ہے، اگر کسی نے مسلمان کی جان مال پر حملہ کیا تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے کعبہ کو ڈھادیا۔ العیاذ باللہ۔

ایک صاحب کا واقعہ

ایک صاحب اپنا قصہ بیان کر رہے تھے کہ وہ دفتر سے گھر جا رہے تھے، پیسوں کا تھیلہ ہاتھ میں تھا، دو صاحبان راستے میں آگئے، پہلے پستول دکھایا اور ایک تھپڑ مارا، دو گالیاں دیں، اور پھر کہا کہ جو کچھ ہے وہ ہمارے حوالے کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ صرف مال لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جان، مال اور آبرو، تینوں پر حملہ کیا، اور یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم کیا کام کر رہے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ آخر ہمیں مرنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جانا ہے، اور یہ زندگی جس میں ہم جی رہے ہیں، معلوم نہیں ہے کہ ایک دن کی ہے یا زیادہ کی ہے، جو آدمی دوسروں پر پستول لئے پھرتا ہے اس کی زندگی بھی موہوم ہے، پتہ نہیں صبح موت کو دیکھے یا شام کو دیکھے، اس دنیا سے جانا یقینی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ کام کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو ہدایت عطا فرمائے اور فکر عطا فرمائے۔ اور ہمیں بھی حقوق العباد کی فکر کرنی چاہئے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی، نہ مالی اور نہ آبرو کی، اور اگر دوسروں کو ہم سے تکلیف پہنچی ہو تو فوراً اس کو معاف کرانے کی فکر کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسکی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ٢١

تکبّر کا علاج "ذلت نفس"

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
١٨٨/١-لیاقت آباد، کراچی ١٩

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۱

صفحات : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مجلس نمبر ۲۱

تکبر کا ایک علاج "ذلّت نفس"

الحمدللّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبۃ للمتقین۔
والصّلوٰۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم وعلٰی آلہ
واصحابہ اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

انانیت کا علاج ذلّتِ نفس ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

"یہ "انانیت" بڑا حجاب ہے، اس کا علاج بدون ذلّتِ نفس نہیں ہو سکتا۔"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۹)

یعنی تکبر کا اصل سبب "انانیت" ہوتا ہے، انانیت کے معنٰی ہیں "اپنے آپ کو بڑا سمجھنا" اس کے نتیجے میں انسان یہ چاہتا ہے کہ میری عزت کی جائے، لوگ میری تعظیم کریں، مجھے بڑا سمجھیں، میرا اکرام کریں۔ لہٰذا اس "انانیت" کا علاج

اس کی ضد کو اختیار کرنے سے ہوگا، وہ یہ کہ اس نفس کو تھوڑا سا ذلیل کیا جائے، کیونکہ جب اس نفس کو ذلیل اور پامال کیا جائے گا تو پھر یہ اعتدال پر آجائے گا، اسی کا نام "مجاہدہ" ہے۔ مجاہدہ کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ نفس جو بے اعتدالیوں کا عادی بن چکا ہے، اس کو اعتدال پر لانے کے لئے کوئی ایسا کام کیا جائے جو اس نفس پر شاق گزرے، جب وہ شاق کام کرے گا تو رفتہ رفتہ وہ اعتدال پر آجائے گا۔

مجاہدہ کی حقیقت

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! مجاہدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور مجاہدہ میں تو بعض اوقات جائز اور مباح کام بھی ترک کرنے پڑتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو وہ کام حلال اور جائز قرار دیے ہیں، لیکن ان جائز کاموں کو بھی مجاہدہ کے اندر ترک کرایا جاتا ہے۔ جواب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ یہ ایک ورق ہے، تم اس کا ایک کونا موڑ دو، اب ورق کو سیدھا کرو۔ لیکن اب سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت میں موڑ دو، اب سیدھا ہو جائے گا۔ پھر فرمایا کہ یہ ہمارا نفس گناہوں اور بے اعتدالیوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو اگر سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، یہ اس وقت سیدھا ہوگا جب اس کو تم مخالف سمت میں موڑ دو گے، اور مخالف سمت میں موڑنے کے لئے جائز اور

مباح کام بھی اس سے چھڑانے پڑیں گے، پھر یہ نفس معتدل ہو جائے گا، اس کا نام "مجاہدہ" ہے۔

کھانے میں پانی ملانا

چنانچہ بعض صوفیاء کرام سے جو یہ منقول ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے کہتے ہیں کہ کھانے میں پانی ملا کر کھاؤ، عام حالات میں یہ حکم نہیں ہے، بلکہ عام حالات میں تو وہ حکم ہے جو قرآن کریم کے اندر منقول ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۝

(سورۃ المؤمنون، آیت ۵۱)

یعنی اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، اچھا کھاؤ اور اچھا عمل کرو۔ لیکن چونکہ نفس غلط جانب میں مڑا ہوا ہے، اس لئے اس کو اعتدال میں لانے کے لئے ایسے مجاہدات کی ضرورت ہوتی ہے جس میں مباحات بھی ترک کرائے جاتے ہیں۔

"ذلّت نفس" بذات خود مقصود نہیں

یہی معاملہ "ذِلّت نفس" کا ہے کہ عام حالات میں اپنے نفس کو ذلیل کرنا پسندیدہ نہیں، نفس کی بھی ایک عزت ہے، اور یہ نفس بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عطا ہے، اس لئے بلاوجہ اس کو ذلیل کرنا پسندیدہ نہیں، لیکن جب نفس تکبر کرنے لگے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے، اور اپنی بڑائی اس کے دل میں آنے لگے تو

ان بیماریوں کو ختم کرنے کے لئے کبھی کبھی نفس کو ذلیل بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کو ذلیل کرنے کے لئے مشائخ مختلف تدبیریں بتاتے ہیں، اور یہ تدبیریں ہر شخص کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات ذلتِ نفس کے لئے نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرائی جاتی ہیں کہ مسجد کے باہر جو جوتیاں رکھی ہیں، ہر نماز کے وقت ان کو سیدھا کیا کرو۔ بعض اوقات ذلتِ نفس کے لئے یہ تدبیر بتائی جاتی ہے کہ متکبر نماز کے بعد مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے کہ بھائیو! میرے اندر تکبر کا مرض ہے، آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے تکبر کا یہ مرض دور کر دے۔ جب متکبر مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے گا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے تو پھر اس کے اندر وہ بیماری کہاں باقی رہے گی۔

ذکر بذاتِ خود مقصود ہے

حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، انہوں نے آکر کہا کہ حضرت! میں بہت ذکر کرتا ہوں، لیکن ذکر سے کچھ نفع نہیں ہوتا، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ ذکر کرنا سب بیکار جا رہا ہے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ ویسے تو ذکر کسی حال میں بیکار نہیں ہوتا، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو، لوگ ذکر کے بعد اس کے نتائج اور ثمرات کے منتظر رہتے ہیں، ان ثمرات اور نتائج کی طرف زیادہ التفات نہیں کرنا چاہئے، ہمارے بزرگوں کا یہ مذاق نہیں تھا، بلکہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کا مذاق یہ ہے کہ ذکر بذاتِ خود مقصود ہے، ذکر کے بعد اس کے ثمرہ اور نتیجہ کا منتظر رہنا درست نہیں، بلکہ

ذکر ہی کو بذات خود مقصود سمجھ کر انسان کرتا رہے، کیفیات وغیرہ کی طرف ذہن کو نہ لیجائے کہ دیکھیں ذکر سے کیا کیفیت طاری ہو رہی ہے، بلکہ اگر کیفیت پیدا ہو رہی ہے تو اس کو ہونے دے، اس کی طرف توجہ نہ کرے۔

"ذکر" سے مقابلے کی قوت پیدا ہوتی ہے

لہٰذا اس مرید نے یہ جو کہا کہ ذکر سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کے ذکر میں اخلاص کی کمی ہو، کیونکہ اگر اخلاص نہ ہو تو ذکر واقعۃً بیکار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذکر کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ذکر کرنے کے نتیجے میں آدمی کے اندر گناہوں کے تقاضے سے مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اگر انسان ذاکر ہے تو اس کے لئے گناہوں کے تقاضے کا مقابلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، مثلاً شیطان نے بھکایا کہ یہ گناہ کرلو، یا نفس نے آمادہ کیا کہ یہ گناہ کرلو، اب عام حالات میں انسان نفس اور شیطان کے دفاع میں کمزور پڑ جاتا ہے اور بعض اوقات نفس و شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے، لیکن ذکر انسان کے اندر نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کر دیتا ہے۔

ذکر اللہ ایک انرجی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اللہ کا ذکر "انرجی" ہے، کس چیز کے لئے انرجی ہے؟ نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے "انرجی" ہے، کیونکہ ذکر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے

نتیجے میں نفس و شیطان کے ساتھ لڑائی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ صبح کے وقت فجر کے بعد ذکر کیا کرو۔ ویسے تو کسی بھی وقت ذکر ہو سکتا ہے، لیکن فجر کے بعد یا فجر سے پہلے ذکر کرنے کا جو طریقہ مقرر فرمایا، اس کی کئی وجوہات ہیں۔

صبح کے وقت ذکر کی وجہ

ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت میں نمو اور نشو و نما کی خاص صلاحیت رکھی ہے، مثلاً صبح کے وقت میں پھول کھلتے ہیں، کلیاں بھی صبح چٹکتی ہیں، پرندے اس وقت بیدار ہوتے ہیں، لہٰذا اس وقت جب کوئی شخص ذکر کرے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ ذکر اس کے اندر روحانی نمو پیدا کرے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب آدمی صبح کے وقت بیدار ہوا، اب تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی کارزار زندگی میں اترنے والا ہے، زندگی کے معرکے میں اترنے والا ہے، جہاں قدم قدم پر اس کو نفس و شیطان کے دواعی سے سابقہ پیش آئے گا، کبھی آنکھ کو غلط استعمال کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوگا، کبھی کان کو غلط استعمال کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوگا، کبھی دل میں زبان کو غلط استعمال کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا، کبھی دل میں کسی اور گناہ کا داعیہ پیدا ہوگا، چنانچہ کارزار زندگی میں چاروں طرف گناہوں کے محرکات پھیلے ہوئے ہیں، جن سے بچنے کے لئے انسان کو کشتی لڑنی پڑے گی۔

تکبر کے نتیجے میں ذکر سے فائدہ نہیں ہوتا

لہٰذا جب تم نفس و شیطان کے ساتھ مقابلے کے لئے دنگل میں اتر رہے ہو تو کچھ طاقت اور توانائی پیدا کر کے جاؤ، اور یہ طاقت اور توانائی اللہ کے ذکر سے پیدا ہوگی، اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ صبح اٹھ کر نماز فجر سے پہلے یا نماز فجر کے بعد اللہ کا ذکر کر لیا کرو تاکہ نفس و شیطان سے مقابلہ آسان ہو جائے، یہ بھی ذکر کا ایک فائدہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید یہ بتانا چاہتے ہوں کہ میں ذکر کر رہا ہوں، لیکن اس کے باوجود گناہوں سے حفاظت نہیں ہو پا رہی ہے۔ حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف توجہ کی تو پتہ چلا کہ ذکر سے نفع نہ ہونے کی وجہ "تکبر" ہے، اور جب آدمی کے اندر "تکبر" ہوتا ہے تو پھر اس کو ذکر سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔

فنِ طب کا ایک اصول

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے، فرمایا کہ "خمیرہ گاؤزبان" یا "خمیرہ مروارید" جسم میں تقویت پیدا کرنے کے لئے کھائے جاتے ہیں، لیکن یہ اس وقت تقویت دیتے ہیں جب انسان کے جسم کے اندر کوئی بیماری نہ ہو۔ اور اگر جسم کے اندر کوئی بیماری موجود ہے تو "فن طب" کا اصول یہ ہے کہ بیماری کے وقت میں جو طاقت کی چیز جسم کے اندر پہنچے گی وہ "خلط غالب" کی طرف مستحیل ہو جائے گی، مثلاً اگر جسم کے اندر بلغم بن رہا ہے تو اس وقت اگر تقویت کی چیز کھاؤ گے تو اس سے بلغم ہی بنے گا، اور اس خمیرہ سے

فائدہ پہنچنے کے بجائے الٹا نقصان ہو گا۔ اسی لئے تمام اطباّء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس وقت آدمی کی طبیعت اعتدال پر نہ ہو، اس وقت مقویات کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے اندر "تکبر" کی بیماری موجود ہے اور شیخ نے اس کو ذکر کرنے کو کہدیا تو چونکہ پہلے سے تکبّر موجود ہے، اس لئے اس ذکر کے نتیجے میں اور زیادہ خنّاس پیدا ہو جائے گا، اور اب اس بات کا بھی تکبر پیدا ہو جائے گا کہ میں تو بڑا عابد زاہد بھی ہوں، اس وجہ سے ایسے شخص کا علاج دوسرے طریقے سے کیا جاتا ہے۔

تکبر کا ایک علاج

بہر حال! حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ کی تو پتہ چلا کہ یہ بیچارہ "تکبر" میں مبتلا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کو ذکر سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے، اس لئے حضرت نے سوچا کہ پہلے اس کی بیماری کا علاج کرنا چاہئے، چنانچہ آپ نے اس مرید سے فرمایا کہ تم ایسا کرو کہ اخروٹوں کا ٹوکرا اٹھاؤ اور فلاں محلّے میں چلے جاؤ اور یہ اعلان کرو کہ جو شخص مجھے ایک دھول (مکہ) لگائے گا، اس کو ایک اخروٹ ملے گا، اس مرید نے یہ سن کر کہا کہ "اللہ اکبر، میں ایسا کروں؟" علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "کمبخت، یہ اللہ کا نام وہ ہے کہ اگر سو سال کا کافر بھی کہے تو مسلمان ہو کر جنّت میں چلا جائے گا، مگر تو نے جس موقع پر یہ نام لیا ہے اس سے تو کافر ہو گیا، کیونکہ "اللہ اکبر" سے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی

بیان کی جاتی ہے، اور تو نے اس لفظ کو اپنی عظمت کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے، اس لئے کہ تمہارا مقصد یہ تھا کہ اللہ اکبر میں اتنا بڑا آدمی، میرا اتنا اونچا مرتبہ اور میں ایسا کام کروں کہ لوگوں کے سامنے یہ اعلان کروں کہ جو آدمی مجھے ایک ڈھول مارے گا میں اس کو ایک اخروٹ دوں گا، لہٰذا چونکہ تو نے یہ کلمہ اپنی عظمت کی خاطر استعمال کیا ہے، اس لئے تیرے اوپر اندیشہ کفر کا ہے۔

اپنی طرف سے علاج تجویز مت کرو

بہر حال، حضرت فرما رہے ہیں کہ بعض اوقات نفس کو تھوڑا سا ذلیل کر کے اس "انانیت" کا علاج کرنا پڑتا ہے، البتہ یہ نفس کی تذلیل ہر شخص کے لئے اس کے مناسب بتائی جاتی ہے، اس لئے کوئی شخص اپنا علاج اپنی تجویز سے کبھی نہ کرے، کیونکہ اس سے بعض اوقات نقصان ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو تذلیل نفس کا ایک ذرا نشتر بھی کافی ہو جاتا ہے، کیونکہ شریف آدمی کے لئے معمولی سی مہمیز بھی کافی ہو جاتی ہے، لفظوں کا معمولی سا تازیانہ بھی کافی ہو جاتا ہے اور اسی سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اس کا تکبر دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب کسی کو یہ معلوم ہوا کہ نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنا تذلیل نفس کا ذریعہ ہے، تو اس نے خود اپنی مرضی سے یہ علاج شروع کر دیا یاد رکھئے! ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنے معالج اور اپنے شیخ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنا چاہئے، وہ جانتا ہے کہ اس شخص کے لئے کونسا طریقہ فائدہ مند ہوگا۔

کبر کی وجہ اللہ کی عظمت کا دل میں نہ ہونا ہے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

ہمارے اندر تکبر اس وقت تک ہے، جب تک حق تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں آئی اور اگر عظمت حق دل میں آجائے تو پھر یہ حال ہوگا۔

چوں سلطان عزت علم برکشد
جہاں سر بجیب عدم درکشد

(انفاس عیسیٰ، ص۱۵۹)

یعنی تکبر کا فساد اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تک اللہ جل شانہ کی عظمت دل میں نہیں بیٹھی، اس وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت ہوتی تو پھر کیسے اپنے آپ کو بڑا سمجھ سکتا تھا، اس وقت تو پرکاہ کے برابر بھی اپنی وقعت نہ سمجھتا، لہٰذا دل میں جتنی اللہ تعالیٰ کی عظمت کم ہوگی، اتنا ہی دل میں تکبر ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت جتنی دل میں پیوست ہوگی، اتنا ہی تکبر کم ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کا تصور اور دھیان ہر وقت کرے، اس کی قدرت کاملہ کا، اس کے علم کامل کا، اس کی رحمت کاملہ کا تصور کرے، اس سے تکبر دل سے چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۲

رمضان کیلئے اعمال مؤخر کرنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/ا۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۲

صفحات : ۱۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۲۲

رمضان کیلئے نیک اعمال کو مؤخر کرنا

الحمدللّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبۃ للمتقین۔
والصّلوٰۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم۔
وعلٰی آلہ واصحابہ اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

الحمد للہ، ''کبر اور خود رائی'' سے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جو ارشادات تھے، ان کا بیان بقدر ضرورت مکمل ہو گیا، اب رمضان المبارک کا ایک ہی دن باقی ہے، رمضان المبارک سے متعلق حضرت والا کا ایک ارشاد مذکور ہے، خیال ہوا کہ آج اسی کو بیان کر دیا جائے۔ یہ بڑے کام کا ارشاد ہے:

تاخیر اعمال الی رمضان

حضرت والا نے فرمایا کہ:

''اللہ اور رسول کو تاخیر طاعات مطلوب نہیں، بلکہ تسارع و

تسابق الی الخیر مطلوب ہے" چنانچہ جا بجا:

فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ۔ (سورۃ البقرۃ، آیت ۱۴۸)

یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۴)

نص میں وارد ہے، اسی طرح حدیث "تضاعف ثواب فی رمضان" کا مطلب "تعجیل اعمال فی رمضان" ہے، نہ کہ "تاخیر اعمال الیٰ رمضان" یعنی رمضان کے اندر طاعات کے اندر جلدی کی جائے، یعنی جن طاعات کی ہمت ہوسکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہوسکے اس کو جلدی سے رمضان ہی میں کرلو، رمضان کے بعد کے لئے مؤخر نہ کرو، کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے۔ پس اگر ۲۸/ شعبان کو زکوٰۃ کا سال پورا ہوتا ہو تو ۲۸/ شعبان کو زکوٰۃ ادا نہ کرنا، بلکہ رمضان کے لئے اس کو ملتوی کرنا عدم تفقہ اور مقصد شارح نہ سمجھنے کی دلیل ہے، ارے تم کو کیا خبر کہ مساکین پر کیا گزر رہی ہے، تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کو روح کی ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے۔

علاوہ اس کے رمضان میں کمیۂ ثواب بڑھتا ہے اور تعجیل وسبقت فی الخیر میں کیفیۂ ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیت ہے، چنانچہ اس کی نظیر علماء

کرام کے کلام میں بھی ہے۔
وہ لکھتے ہیں کہ حدیث میں ہے: محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا ثواب ملتا ہے، اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا، مگر محلّے والوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ محلّے کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں، اگر ایسا کریں گے تو گناہ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جامع مسجد کی نماز کا ثواب اس کے حق میں کمیۃً زیادہ ہے مگر محلّے کی مسجد کا ثواب کیفیۃً زیادہ ہے، کیونکہ اس کے ذمے اسی مسجد کی آبادی واجب ہے، تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے، اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا، کیونکہ اس کے ذمے اس مسجد کی عمارت و آبادی واجب نہیں، بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلّے والوں کے ذمے ہے۔

اوپر جو بحث تاخیر حسنہ الی رمضان کی ہے، اس کے تتمہ میں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ کیا عجب ہے کہ اس وقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا، اس کی دعا عرش سے کتنی اوپر گئی ہوگی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہوگا، اور مان لو کہ اس وقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو، اگر تم

کہو کہ ہم وصیّت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو وصیّت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں، دوسرے کیا بھروسہ کہ ورثاء ادا بھی کریں گے۔

(انفاس عیسیٰ ص)

لوگوں کی ایک غلطی

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑی اصولی بات بیان فرمادی جو بکثرت مغالطوں اور غلطیوں کا سبب بنتی ہے، چنانچہ بہت لوگوں کو دیکھا کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہو گئی ہے مگر اس انتظار میں روکے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت زکوٰۃ نکالیں گے، یا مثلاً کچھ صدقہ کرنے کی نیت ہے لیکن روکے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت صدقہ کریں گے، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ رمضان میں نفل کام کا ثواب فرض کے برابر ملے گا اور فرض ادا کرنے پر ستر گنا ثواب ملے گا۔ اس حدیث کی وجہ سے لوگ زکوٰۃ اور صدقہ کی ادائیگی کو رمضان کے لئے مؤخر کر دیتے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت ادا کریں گے۔

تضاعف ثواب والی حدیث کا مطلب

حضرت والا نے دو لفظوں میں اس حدیث کی تشریح فرمادی کہ اس حدیث کا مقصود "تعجیل اعمال فی رمضان" ہے، نہ کہ "تاخیر اعمال الی رمضان"

یعنی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں جب نیکی کا اتنا زیادہ ثواب ہے اور تمہارے دل میں کسی نیکی کے کرنے کا خیال آرہا ہے تو اس نیکی کو ابھی فوراً رمضان کے اندر ہی کرلو اور اس کو مت ٹالو، کیونکہ رمضان میں نیک کام کرنے کا ثواب زیادہ ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر رمضان سے پہلے کسی نیکی کا خیال آیا ہے تو اس خیال کو ٹال دو کہ یہ نیکی رمضان میں کریں گے، تاکہ اس وقت ثواب زیادہ ملے۔

لہٰذا جس وقت جس نیکی کے کرنے کا خیال آئے، چاہے وہ نفل کام ہو یا فرائض کی ادائیگی ہو، اسی وقت اس کو کرلو۔

نیک کاموں میں جلدی مطلوب ہے

حضرت نے دلیل اس کی یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم میں کئی جگہوں پر یہ حکم آیا ہے کہ:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ۔

(سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۳)

دوسری جگہ ہے:

فَاسْتَبِقُوْا الْخَیْرٰتِ۔

(سورۃ البقرۃ، آیت ۱۴۸)

یعنی دوڑ دوڑ کر جنّت کے اعمال کی طرف جاؤ اور ان کو جلدی کرو، دیر مت کرو۔ اب قرآن کریم تو ہمیں یہ حکم دے رہا ہے، لیکن ہم انتظار کر رہے ہیں کہ جب

رمضان آئے گا تو اس وقت یہ عمل کروں گا، قرآن و سنّت کی نصوص کے بالکل خلاف ہے۔

زکوٰۃ کس وقت واجب ہوتی ہے؟

خاص طور پر زکوٰۃ کے مسئلے میں لوگوں کو بہت غلط فہمی ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہم رمضان ہی میں زکوٰۃ نکالیں گے، چاہے ان کی زکوٰۃ کا سال ربیع الاوّل کے مہینے میں پورا ہو جاتا ہو۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر آدمی کے لئے زکوٰۃ ادا کرنے کی وہ تاریخ ہے جس تاریخ میں وہ پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا تھا، پھر جب آئندہ سال وہی تاریخ آئے گی تو اس دن اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی، مثلاً ایک شخص یکم ربیع الاوّل کو نصاب زکوٰۃ مال کا مالک بن گیا، تو اگلے سال یکم ربیع الاوّل ہی کو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی، اب اس شخص کو آئندہ ہمیشہ یکم ربیع الاوّل ہی کو اپنے اموالِ زکوٰۃ کا حساب لگانا چاہئے، یہ نہ ہو کہ صاحبِ نصاب تو آپ یکم ربیع الاوّل کو بنے اور حساب یکم رمضان المبارک کو لگا رہے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں۔

زکوٰۃ کا حساب لگانے میں غلطی

لیکن آج کل لوگ بہت کثرت سے دو غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ بہت سے لوگ حساب لگانے کی تاریخ مقرر کرنے میں غلطی کرتے ہیں، مثلاً صاحب نصاب بننے کی تاریخ یکم ربیع الاوّل تھی، لیکن خود اپنی طرف سے زکوٰۃ کا

حساب کرنے کی تاریخ یکم رمضان مقرر کرلی تو اس کے نتیجے میں سارا حساب خراب ہو جاتا ہے، کیونکہ جب زکوٰۃ فرض ہونے کی تاریخ آپ کی یکم ربیع الاوّل تھی، اس دن تو آپ نے حساب نہیں لگایا، اور پھر ان پیسوں کو خرچ کرتے رہے، یہاں تک کہ یکم رمضان المبارک تک اس میں سے آدھی رقم خرچ ہو گئی، اس وقت آپ زکوٰۃ کا حساب لگانے بیٹھ گئے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدھی رقم کا حساب ہی نہیں ہوا۔

ایک مثال

مثلاً یکم ربیع الاوّل کو آپ کی زکوٰۃ کا سال پورا ہوا، اس وقت آپ کے پاس ایک لاکھ روپے تھے، تو آپ پر ایک لاکھ روپے کی زکوٰۃ ڈھائی ہزار روپے واجب ہو گئی، لیکن آپ نے یکم ربیع الاوّل کو حساب نہیں لگایا، یہاں تک کہ رمضان المبارک آگیا، اور اس وقت تک اس رقم میں سے پچاس ہزار روپے خرچ کر لئے، اور اب یکم رمضان کو آپ کے پاس صرف پچاس ہزار روپے باقی رہ گئے، اور اس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب لگا کر پچاس ہزار روپے کی زکوٰۃ ساڑھے بارہ سو روپے ادا کر دی، اور اس طرح وہ پچاس ہزار روپے جو آپ نے خرچ کر لئے، نہ تو اس کا حساب لگایا اور نہ اس کی زکوٰۃ ادا کی، حالانکہ ان پچاس ہزار روپے پر بھی زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ اور ان پچاس ہزار روپے کا حساب بھی نہیں لگایا، حالانکہ اگر حساب لگایا ہوتا تو پھر اس بات کی توقع تھی کہ چلو ابھی تو زکوٰۃ ادا نہیں کی، لیکن آئندہ کسی وقت اس کی زکوٰۃ ادا کر دے گا، لیکن جب

حساب ہی نہیں لگایا تو اب آئندہ زندگی میں ادائیگی کے ذریعہ اس کی تلافی بھی نہیں ہو پائے گی، یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ جس تاریخ کو آدمی صاحبِ نصاب بنا، اسی تاریخ میں آئندہ ہر سال حساب لگانا ضروری ہے، اس میں غلطی کرنے سے بہت بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم کو روک کر رکھنا

بعض حضرات یہ کرتے ہیں کہ حساب تو صحیح تاریخ پر کر لیتے ہیں، مثلاً یکم ربیع الاوّل ہی کو حساب کر لیا اور اپنے پاس لکھ کر رکھ لیا کہ ڈھائی ہزار روپے زکوٰۃ میرے اوپر فرض ہے اور اس رقم کو علیحدہ کر کے رکھ دیا، لیکن اس رقم کو روکے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آئے گا تو اس وقت دیں گے، کیونکہ رمضان میں اس پر ستر گناہ ثواب ملے گا، اس لئے اس وقت ادا کر دیں گے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں اسی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔

مالِ زکوٰۃ میں مسکین کا حق متعلق ہو گیا

اس میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ مسکین کا حق ہے، جس وقت تم پر زکوٰۃ فرض ہو گئی تو اس کے بعد اس زکوٰۃ کی رقم میں تمہارا حق ہی باقی نہیں رہا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَفِیٓ اَموَالِھِم حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالمَحرُومِ۔

(سورۃ الذاریات، آیت ۱۹)

یعنی ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی سب کا حق تھا۔

لہٰذا جب یہ مسکین کا حق ہے تو اب یہ ایک طرح سے تمہارے اوپر قرض اور دین ہے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ تم اس کو فوراً صاحب حق تک پہنچاؤ، دیر کرنا ٹھیک نہیں۔

مسکین پر فاقے اور تم پر عیّاشی

دوسری بات یہ ہے کہ تمہیں تو یہ عیّاشی سوج رہی ہے کہ ستر گنا ثواب ملنا چاہئے اور جو مسکین اور مستحق زکوٰۃ ہے، اس کے اوپر فاقے پڑ رہے ہیں، اس کی جان کے لالے پڑ رہے ہیں۔ لہٰذا تم اس کو زکوٰۃ وقت پر پہنچا دو تاکہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

کمیت اور کیفیت کا فرق

تیسری بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمائی کہ یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں ستر گنا ثواب ملے گا، یہ گنتی کے حساب سے ہے، لیکن ایک اور چیز ہوتی ہے جس کو "کیفیت" کہا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کی کمیت اور گنتی تو زیادہ نہیں ہوتی، لیکن اس کی کیفیت اور فائدہ زیادہ ہوتا ہے، آج کل کیفیت کو "کولیٹی"

اور کمیت کو "کاؤنٹیٹی" کہا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص کے پاس کپڑے کے دس تھان ہیں، لیکن وہ معمولی کپڑا ہے، اور دوسرے شخص کے پاس ایک تھان کپڑا ہے، لیکن وہ مخمل ہے، اب گنتی کے اعتبار سے اگرچہ پہلا شخص افضل ہے، لیکن کیفیت اور کوالیٹی کے اعتبار سے دوسرا شخص افضل ہے۔

ایک مثال

دیکھئے: بلّی کے ایک وقت میں بہت بچے ہوتے ہیں، اور شیرنی کا ایک وقت میں ایک بچہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بلّی نے شیرنی سے کہا کہ تو جنگل کی رانی اور ملکہ اور بیٹا تیرا ایک، اور میں تو ہر سال درجنوں بچے پیدا کر دیتی ہوں۔ شیرنی نے جواب دیا: خالہ جان! یہ تمہارے بچے بلّی ہیں، اور میرا بچہ ہے تو ایک، لیکن وہ شیر ہے۔ لہٰذا گنتی تو بلّی کے بچوں کی زیادہ ہے، لیکن کیفیت اور طاقت کے اعتبار سے شیر کا ایک ہی بچہ بلّی کے بہت سے بچوں پر حاوی ہے۔ اس لئے کمیت اور گنتی کے اندر بڑھوتری بسا اوقات اتنا فائدہ نہیں دیتی جتنی کیفیت کے اندر بڑھوتری فائدہ دے جاتی ہے۔ اسی طرح آپ نے رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے اس رقم کو روکے رکھا تاکہ ستر گنا ثواب ملے، اور یہ ستر گنا گنتی ہے، لیکن اگر بروقت کسی حاجت مند کی حاجت پوری کر دی اور اس سے اس کو فائدہ پہنچ گیا تو اس میں اگرچہ ثواب کی گنتی شاید کم ہو، لیکن اس ثواب کی کیفیت بہت اعلیٰ اور زیادہ ہو گی۔

محلّے کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنا

پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا، فرمایا کہ محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے پچیس گنا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے پانچ سو گنا ثواب ملتا ہے۔ لیکن شریعت کا حکم یہ ہے کہ محلّے کی مسجد میں نماز پڑھو، کیونکہ محلّے کی اس مسجد کو آباد کرنا تمہاری ذمہ داری ہے، اس لئے کہ تم اہل محلّہ ہو، اب اگر سارے محلّے کے لوگ پانچ سو کا ثواب حاصل کرنے کے چکر میں جامع مسجد چلے جائیں اور محلّے کی مسجد خالی ہو جائے تو وہ گناہ گار ہوں گے، کیونکہ اہل محلّہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے محلّے کی مسجد آباد کریں۔ تو اگرچہ جامع مسجد میں ثواب کی گنتی زیادہ ہے، لیکن محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے ثواب کی کیفیت زیادہ ہے، اس لئے گنتی کے چکر میں مسنون عبادت کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ایک جملہ

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "آپ بیتی" میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا دلچسپ جملہ لکھا ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، حالانکہ تمام فقہاء حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ وتر کے بعد دو رکعتیں بھی کھڑے ہو کر پڑھنا ہی افضل ہے، کیونکہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے اور بیٹھ کر پڑھنے میں آدھا ثواب ہے۔

لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ فقہاء حنفیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ بیٹھ کر پڑھنا جائز تھا، اس لئے جائز ہونے کو بتانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو رکعتوں کو بیٹھ کر پڑھا، لیکن قاعدہ وہی ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب پورا اور بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب آدھا ہوگا۔ کسی نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! کتابوں میں تو یوں لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے، لیکن آپ ہمیشہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح پڑھیں، اس طرح پڑھنے میں جی زیادہ لگے، بڑے ثواب کم ہو، یعنی ثواب کی گنتی چاہے کم ہو جائے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح نماز پڑھی، اس طرح پڑھنے میں ثواب کی کیفیت اعلیٰ ہو جاتی ہے۔

اس لئے بہت سی جگہوں پر گنتی نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اس کی کیفیت دیکھی جاتی ہے، لہٰذا جب وقت کا تقاضہ کسی عمل کے کرنے کا ہو، اس وقت وہ عمل کرلو، اس عمل کو ستر گنا اضافے کے چکر میں ٹالنا دین کی سمجھ کی بات نہیں۔

رمضان تک زندہ رہنے کی گارنٹی ہے؟

پھر تمہارے پاس کونسی گارنٹی لکھی ہوئی ہے کہ تم رمضان تک زندہ رہو گے، کیا معلوم کہ رمضان سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے پاس سے بلاوا آجائے، اور اگر یہ خیال ہو کہ ہم زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کر جائیں گے تو بھائی وصیت کے

بعد بھی کیا بھروسہ ہے کہ وارثین ضرور ادا کریں گے۔ اس لئے رمضان کے انتظار میں کوئی کام مت ٹالو، بلکہ جو وقت کا تقاضہ ہے وہ کر گزرو۔

وقت کے تقاضے پر عمل کرنا دین ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے، یہ دیکھو کہ اس وقت مجھ سے دین کا کیا مطالبہ ہے، وہ کر گزروں۔ مثلاً باپ بیمار ہے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، اگر تم گھر کو چھوڑ کر پانچ منٹ کے لئے جاؤ گے تو باپ کو تکلیف ہوگی، ایسے وقت ایک دوسرا مطالبہ بھی ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے تو آدمی مسجد جاکر جماعت سے نماز ادا کرے، اور جماعت سے نماز پڑھنے کا ستائیس گنا ثواب زیادہ ہے۔ لیکن نماز کے وقت باپ یہ کہہ رہا ہے کہ میری طبیعت خراب ہے، آج تم مسجد نہ جاؤ، گھر پر ہی نماز پڑھ لو۔ تو اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ گھر پر ہی نماز پڑھے، باپ کی خدمت کرے، اور جماعت کے ستائیس گنا ثواب کو چھوڑ دے، کیونکہ وقت کا تقاضہ یہی ہے۔

اپنا شوق پورا کرنا دین نہیں

میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑا خوبصورت جملہ فرمایا کرتے تھے کہ "اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں" مثلاً یہ شوق ہو گیا کہ صف اوّل میں نماز پڑھیں گے، باپ گھر میں مر رہا ہے، اس کو

مرتا ہوا چھوڑ کر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے مسجد میں صف اوّل میں پہنچ گئے۔ یہ دین نہیں، بلکہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ صف اوّل کو چھوڑو اور باپ کی خدمت کرو۔ بہر حال، وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے، یہ دیکھو کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے، وہ مطالبہ پورا کرو۔

کیا نیک کام رمضان کے ساتھ خاص ہیں؟

حضرت والا نے اس ملفوظ میں زکوٰۃ سے متعلق ایک اصول بیان فرمایا۔ لیکن یہ بات صرف زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہی اصول تمام اعمال کے اندر جاری ہے، ہم لوگ رمضان میں تو اعمال کے اندر تھوڑا بہت اہتمام کرتے ہیں، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جتنے نیک کام ہیں، سب رمضان کے لئے اٹھا کر رکھ دیے ہیں، نفلیں پڑھیں گے تو رمضان میں، تلاوت کریں گے تو رمضان میں کریں گے، رات کو اٹھیں گے تو رمضان میں اٹھیں گے، اور اشراق اور چاشت کے نوافل پڑھیں گے تو رمضان میں پڑھیں گے، اس طرح ہم نے سارے کام اٹھا کر رمضان کے لئے رکھ دیئے۔ اور ادھر جیسے ہی رمضان ختم ہوا، ادھر سارے اعمال ختم، اب نہ تو تلاوت ہے، نہ ذکر ہے، نہ نوافل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہے، اور نہ گناہوں سے بچنے کا وہ اہتمام ہے۔ رمضان میں گناہ کرتے ہوئے ذرا شرم آجاتی ہے کہ بھائی! رمضان کا مہینہ ہے، ذرا آنکھ کی حفاظت کر لیں، ذرا کان کی حفاظت کر لیں، ذرا زبان کی حفاظت کر لیں، لیکن رمضان گزرتے ہی گناہوں کی چھٹی مل گئی، اب نہ

گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہے اور جو نیک کام رمضان میں شروع کئے تھے، نہ ان کو باقی رکھنے کا اہتمام ہے۔

رمضان ایک تربیتی کورس

اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کو ایک تربیتی کورس بنایا ہے، جب تم اس تربیتی کورس سے گزر گئے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خاص ملکات مثلاً روزے سے، تراویح سے، اعتکاف سے، ذکر سے، تسبیح اور تلاوت سے تمہارے اندر جو جِلا پیدا فرمادی، اس کو اب برقرار رکھنا تمہارا کام ہے۔ لہٰذا رمضان کے بعد جب تم عام زندگی کے اندر داخل ہو تو اس جذبے کو برقرار رکھنا تمہارا کام ہے۔

دل کو گناہ کے داغ سے بچاؤ

دیکھیے ایک سفید کپڑا ہے جو ابھی ابھی دھوبی کے پاس سے دھل کر آیا ہے، اگر اس پر ذرا سا بھی دھبّہ لگ جائے گا تو وہ نمایاں ہوگا۔ اسی طرح رمضان کے اندر تمہارا دل گناہوں سے دھل کر بالکل صاف ہوگیا، اب اس دل کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرو، تاکہ اس صاف دل پر گناہوں کا کوئی داغ نہ لگ جائے، معصیتوں اور نافرمانیوں کے داغ نہ لگ جائیں، ان سے دل کو بچاؤ۔

رمضان کے بعد تلاوت جاری رکھو

اور رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ نے جن عبادات کی توفیق دی تھی،

اب رمضان کے بعد اس مقدار میں نہ سہی، لیکن اس کا کچھ حصہ تو باقی رہے۔ رمضان المبارک میں تلاوت کی توفیق ہو گئی تھی، اب اس کی کیا وجہ ہے کہ سارے سال قرآن کریم بند پڑا رہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ قرآن کریم رمضان کے لئے رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ طے کر لو کہ رمضان کے بعد بھی کوئی دن تلاوت قرآن سے خالی نہیں گزرے گا، ورنہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ رمضان المبارک میں تو خوب تلاوت کرتے رہے ہیں، اس کے بعد اس کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا کہ جب رمضان کا چاند دیکھیں گے تو اس وقت دوبارہ اٹھائیں گے، یہ بڑی محرومی کی بات ہے، لہٰذا قرآن کریم کی روزانہ تلاوت کا معمول بنایا جائے۔

رمضان کے بعد بھی عبادات پر قائم رہو

رمضان المبارک میں الحمدللہ جماعت سے نماز پڑھنے کا اہتمام ہو جاتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب آئندہ سال تک مسجد کی چھٹی ہو گئی، بلکہ یہ کوشش کرو کہ اللہ تعالیٰ نماز باجماعت پڑھنے کی آئندہ بھی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض و واجبات ہمارے اور آپ کے ذمے عائد کئے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں کہ جن کا کرنا ہمارے لئے مشکل ہو اور آدمی ان کو ادا نہ کر سکے، اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرض ہی کیوں فرماتے۔ لہٰذا جتنے بھی کام ہیں، چاہے وہ فرائض کی ادائیگی ہو یا گناہوں سے بچنا ہو، وہ سب ہماری وسعت اور اختیار میں ہیں، جو کام ہمارے اختیار میں نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے وہ کام فرض ہی

نہیں کیا، بات صرف ہمّت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اس ہمّت کو استعمال کر کے اپنی آئندہ زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور احکام شریعت کے مطابق گزارو۔

صبح کے وقت اللہ سے معاہدہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم صبح کے وقت بیدار ہو تو نماز فجر پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک معاہدہ کرلو، وہ یہ کہ:

اِنَّ صَلاَ تِی وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O

(سورۃ الانعام، آیت ۱۶۲)

اے اللہ! آج کے دن میں جو کام بھی کروں گا، آپ کی رضا کی خاطر کروں گا، یہاں تک کہ کھانا کھاؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر کھاؤنگا، روزی کماؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر کماؤں گا، گھر میں داخل ہوں گا تو آپ کی رضا کی خاطر داخل ہوں گا، بیوی بچوں سے بات کروں گا تو آپ کی رضا کی خاطر کروں گا، سوؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر سوؤں گا۔ صبح اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کرو، اور اللہ تعالیٰ سے کہو کہ میں اس لئے کھانا کھا رہا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر نفس کا حق رکھا ہے، میں اس لئے سو رہا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر نفس کا حق رکھا ہے، بیوی بچوں سے اس لئے باتیں کر رہا ہوں کہ آپ نے میرے

ذمے ان کا حق رکھا ہے، روزی اس لئے کمارہا ہوں کہ آپ نے یہ میرے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ جب اس نیت سے یہ سب کام کرو گے تو یہ سب عبادت بن جائیں گے۔

معاہدہ کا فائدہ

اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! آپ کے ساتھ میں نے جو معاہدہ کیا ہے، آپ کی توفیق کے بغیر اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے اس معاہدے کی تکمیل کی توفیق بھی آپ ہی عطا فرمایئے۔ اور اس معاہدہ کرنے اور دعا کرنے کے بعد کارزار زندگی میں نکل جاؤ۔ اس معاہدہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب کسی غلط کام کا داعیہ سامنے آئے گا تو اس وقت دل میں کھٹک پیدا ہوگی کہ میں نے صبح اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کیا تھا، کہیں مجھ سے اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

رات کو سوتے وقت جائزہ

پھر رات کو جب سونے لگو تو اس وقت دن بھر کا جائزہ لے لو اور یہ سوچو کہ میں نے صبح کو اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کیا تھا، سارے دن کے کام اس معاہدہ کے مطابق ہوئے یا نہیں؟ اگر سب کام اس معاہدے کے مطابق ہوئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو "الحمد للہ" اور اگر کسی موقع پر اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو اس پر استغفار کرو اور کہو کہ اے اللہ! میں نے آپ

سے معاہدہ کیا تھا، لیکن مجھ سے غلطی ہوگئی اور میں بہک گیا اور فلاں موقع پر میرا قدم ڈگمگا گیا، فلاں جگہ میری آنکھ بہک گئی، فلاں موقع پر زبان بہک گئی۔

اَللّٰھم انی استغفرك واتوب الیك۔ اَللّٰھم اِنی استغفرك وأتوب الیك۔ استغفر اللّٰه العلی العظیم۔

چند بار دل سے استغفار کرلو اور یہ عمل کر کے پھر سو جاؤ۔ اور روزانہ صبح وشام یہ عمل کرو، صبح اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کرو اور رات کو سوتے وقت دن بھر کے اعمال کا جائزہ لے لو، انشاء اللہ رفتہ رفتہ سب گناہ چھوٹ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ٢٣

مجاہدہ کی حقیقت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
١٨٨/١۔ لیاقت آباد، کراچی ١٩

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۳

صفحات : ۲۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجلس نمبر ۲۳

مجاہدہ کی حقیقت

الحمد للّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاۃ والسلام علی رسوله الکریم، وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین، امابعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مجاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ معاصی کو تو مطلقاً ترک

کرے اور یہ نفس کی مخالفت واجب ہے، اور مباحات
میں تقلیلاً مخالفت کرے اور یہ مخالفت مستحب ہے، مگر
ایسا مستحب ہے کہ مخالفت واجبہ کا حصول کاملہ اس
مخالفت مستحبہ پر موقوف ہے، جیسے بہت سونا، بہت
کھانا، بہت عمدہ کپڑے پہننا، بہت باتیں کرنا، لوگوں
سے زیادہ ملنا ملانا، سوان میں تقلیل کرے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۲۔۱۳)

حضرت والا نے ان مختصر لفظوں میں "مجاہدہ" کی حقیقت بھی بیان فرمادی اور اس کے درجات بھی بیان فرمادیئے کہ کونسا مجاہدہ واجب ہے؟ اور کونسا مجاہدہ مستحب ہے؟ اور کس حد تک مستحب ہے؟

مجاہدہ کا مفہوم

اس کی تفصیل یہ ہے کہ "مجاہدہ" کے عرفی معنی ہیں "نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرنا" جس کام کو انسان کا نفس چاہ رہا ہو، دل میں خواہش ابھر رہی ہو کہ یہ کام کروں، نفس کی اس خواہش کو کچل کر اور اس کے چاہنے کو چھوڑ کر نفس کو اس کام سے باز رکھنا یہ "مجاہدہ" ہے۔ خواہشات نفس کی مخالفت ہی کو صوفیاء کرام "مجاہدہ" کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ "مجاہدہ" قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کریں گے ہم ان کو
اپنے راستے کی ضرور ہدایت دیں گے۔

عربی زبان میں لفظ "مجاہدہ" کے معنی ہیں، محنت کرنا، کوشش کرنا، اسی مفہوم کا اطلاق صوفیاء کرام کی مروّجہ اصطلاح میں اس کوشش اور جدوجہد پر کیا جاتا ہے جو نفس کی خلاف ورزی میں کی جاتی ہے۔ البتہ مختصر طور پر اسے صرف مخالفت نفس سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔

مجاہدہ واجبہ

نفس کے تقاضوں کی خلاف ورزی بعض حالات میں واجب ہے اور بعض حالات میں مستحب ہے۔ یعنی اگر نفس کسی گناہ کی طرف بلا رہا ہے اور کس گناہ کا تقاضہ دل میں پیدا کر رہا ہے، تو اس تقاضے کی مخالفت کرکے اس کو کچلنا اور مجاہدہ کرنا یہ واجب ہے۔ مثلاً فرض کریں کہ دل میں یہ شدید تقاضہ پیدا ہوا کہ یہ نگاہ کسی نامحرم کو دیکھ کر اس سے لذّت حاصل کرے، اس سے مزہ لے، اب اس تقاضے اور داعیے کی مخالفت کرنا اور اس تقاضے کو کچلنا واجب ہے، اور اس تقاضے پر عمل کرلینا اور اس تقاضے کے آگے ہتھیار ڈالدینا جائز نہیں۔

یا مثلاً دل میں تقاضہ پیدا ہوا کہ میں فلاں کی غیبت کروں، مجلس جمی ہوئی ہے اور دوسروں کا تذکرہ کرتے ہوئے مزہ آ رہا ہے، گفتگو چل رہی ہے، اب دل میں تقاضہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں فلاں کی غیبت کروں، یہاں

اس تقاضے کی مخالفت کرنا واجب ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں انسان کا نفس کسی گناہ پر آمادہ کر رہا ہو، اس وقت اس کی مخالفت کرنا اور مجاہدہ کرنا فرض ہے۔

مجاہدہ مستحبہ

لیکن اگر نفس کسی ایسی چیز کا تقاضہ پیدا کر رہا ہے جو گناہ اور حرام نہیں ہے، ناجائز نہیں ہے، بلکہ وہ مباح ہے، لیکن وہ مباح ایسا ہے کہ اس کے بارے میں بزرگوں کا تجربہ یہ ہے کہ وہ مباح انسان کو رفتہ رفتہ گناہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، ایسے تقاضے کی بھی مخالفت کرنی چاہئے۔ البتہ ایسے موقع پر نفس کی مخالفت کرنا واجب تو نہیں ہے لیکن مستحب ضرور ہے، محض اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تقاضہ رفتہ رفتہ کسی گناہ کے اندر مبتلا کر دے۔

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اللہ جلّ جلالہ تک پہنچنا "مجاہدہ" کے بغیر نہیں ہو سکتا، مجاہدہ تو کرنا پڑے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرمادیا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے کی ہدایت کو "مجاہدہ" پر موقوف کیا ہے، جب مجاہدہ کرو گے تو ہم تمہیں راستہ کی ہدایت دیں گے، مجاہدہ کے بغیر وصول نہیں ہو سکتا۔

اپنے نفس کو چھوڑ دو

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں اللہ جل شانہ کی زیارت کی۔ بیداری کے عالم میں رہتے ہوئے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنا ممکن نہیں، البتہ خواب میں اللہ تعالیٰ زیارت کرا دیتے ہیں، کس طرح کراتے ہیں؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی جانے، ہمیں کیا معلوم۔ بہر حال! اس زیارت کے موقع پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ:

كَيْفَ السَّبِيْلُ إِلَيْكَ ؟

یا اللہ! آپ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

اُتْرُكْ نَفْسَكَ وَتَعَال

اپنے نفس کو چھوڑ و اور ہمارے پاس چلے آؤ۔

یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرو اور اس کے تقاضوں کو دباؤ، جب یہ عمل کرو گے تو ہم تک پہنچ جاؤ گے۔

اصلی مجاہد

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسه

(ترمذی، فضائل الجہاد، باب ماجاء فی فضل من مات مرابطاً، حدیث نمبر۱۶۲۱)

فرمایا کہ اصل "مجاہد" وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، لڑائی کے میدان میں دشمن سے لڑنا بھی "جہاد" ہے، لیکن اصلی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے اس طرح جہاد کرے کہ نفس کی خواہشات، نفس کی آرزوئیں، نفس کے تقاضے ایک طرف بلارہے ہیں اور انسان نفس کے ان تقاضوں اور آرزوؤں کو پامال کر کے دوسرا راستہ اختیار کرلیتا ہے تو اس کا نام "مجاہدہ" ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اپنی اصلاح کی طرف قدم بڑھانا چاہے اور اللہ جل شانہ کی طرف قدم بڑھانا چاہے تو اس کو "مجاہدہ" کرنا ہی پڑتا ہے۔ یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرنا اور نفسانی خواہشات کے خلاف زبرستی کر کے محنت کر کے کوشش کر کے کڑوا گھونٹ پی کر عمل کرنا، اور کسی طرح اپنے نفس کی خواہشات کو دبا کر اور کچل کر اس کی خلاف ورزی کرنا، اس کا نام "مجاہدہ" ہے۔

انسان کا نفس لذّتوں کا خوگر ہے

ہمارا اور آپ کا نفس یعنی وہ قوت جو انسان کو کسی کام کے کرنے کی طرف ابھارتی ہے، وہ نفس دنیاوی لذّتوں کا عادی بنا ہوا ہے، لہٰذا جس کام میں اس کو ظاہری لذّت اور مزہ آتا ہے اس کی طرف یہ دوڑتا ہے، یہ اس کی جبلّت اور خصلت ہے کہ ایسے کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، یہ

انسان سے کہتا ہے کہ یہ کام کرلو تو مزہ آجائے گا، یہ کام کرلو تو لذّت حاصل ہو جائے گی، لہٰذا یہ نفس انسان کے دل میں خواہشات کے تقاضے پیدا کرتا رہتا ہے، اب اگر انسان اپنے نفس کو بے لگام اور بے مہار چھوڑ دے اور جو بھی لذّت کے حصول کا تقاضہ پیدا ہو، اس پر عمل کرتا جائے، اور نفس کی ہر بات مانتا جائے، تو اس کے نتیجے میں پھر وہ انسان انسان نہیں رہتا بلکہ جانور بن جاتا ہے۔

خواہشات نفسانی میں سکون نہیں

نفسانی خواہشات کا اصول یہ ہے کہ اگر ان کی پیروی کرتے جاؤ گے اور ان کے پیچھے چلتے جاؤ گے اور اس کی باتیں مانتے جاؤ گے، تو پھر کسی حد پر جاکر قرار نہیں آئے گا، انسان کا نفس کبھی یہ نہیں کہے گا کہ اب ساری خواہشات پوری ہوگئیں، اب مجھے کچھ نہیں چاہئے، یہ کبھی زندگی بھر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کسی انسان کی ساری خواہشات اس زندگی میں پوری نہیں ہوسکتیں، اور اس کے ذریعہ کبھی قرار اور سکون نصیب نہیں ہوگا، یہ اصول کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نفس کے ہر تقاضے پر عمل کرتا جاؤں اور ہر خواہش پوری کرتا جاؤں تو کبھی اس شخص کو قرار نہیں آئے گا، کیوں؟ اس لئے کہ اس نفس کی خاصیت یہ ہے کہ ایک لطف اٹھانے کے بعد اور ایک مرتبہ لذّت حاصل کرلینے کے بعد یہ فوراً دوسری لذّت کی طرف بڑھتا ہے، لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل چل کر

سکون حاصل کرلو، تو ساری عمر بھی سکون نہیں ملے گا، تجربہ کر کے دیکھ لو۔

یہ پیاس بجھنے والی نہیں

آپ نے ایک بیماری کا نام سنا ہوگا جس کو "جوع البقر" کہتے ہیں، اس بیماری کی خاصیت یہ ہے کہ انسان کو بھوک لگتی رہتی ہے، جو دل چاہے کھالے، جتنا چاہے کھالے، مگر بھوک نہیں مٹتی۔ اسی طرح ایک اور بیماری ہے جس کو "استسقاء" کہا جاتا ہے، اس بیماری میں انسان کو پیاس لگتی رہتی ہے، گھڑے کے گھڑے پی جائے، کنویں بھی ختم کر جائے، مگر پیاس نہیں بجھتی۔ یہی حال انسان کی خواہشات کا ہے، اگر ان کو قابو نہ کیا جائے اور ان پر کنٹرول نہ کیا جائے، اور جب تک ان کو شریعت اور اخلاق کے بندھن میں نہ باندھا جائے، اس وقت تک اس کو "استسقاء" کی بیماری کی طرح لطف ولذّت کے کسی بھی مرحلے پر جاکر قرار نصیب نہیں ہوتا، بلکہ لذت کی وہ ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تھوڑی سی مشقّت برداشت کرلو

اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے مت چلو، ان کا اتباع مت کرو، اس لئے کہ یہ تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جاکر ڈال دیں گی، بلکہ ان کو ذرا قابو

میں رکھو، اور ان کو کنٹرول کر کے شریعت کی معقول حدود کے اندر رکھو، اگر تم ان کو قابو میں رکھنا چاہو گے تو شروع شروع میں یہ نفس تمہیں ذرا تنگ کرے گا، تکلیف ہوگی، صدمہ ہوگا، دکھ ہوگا، ایک کام کو دل چاہ رہا ہے مگر اس کو روک رہے ہیں، دل چاہ رہا ہے کہ ٹی وی دیکھیں اور اس میں جو خراب خراب فلمیں آرہی ہیں وہ دیکھیں، یہ نفس کا تقاضہ ہو رہا ہے، اب جو آدمی اس کا عادی ہے اس سے کہو کہ اس کو مت دیکھ، اور اس نفسانی تقاضہ پر عمل نہ کر، اگر وہ نہیں دیکھے گا اور آنکھ کو اس سے روکے گا، تو شروع میں اس کو دقت ہوگی اور مشقت ہوگی، برا لگے گا، اس لئے کہ وہ دیکھنے کا عادی ہے، اس کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، لطف نہیں آتا۔

یہ نفس کمزور پر شیر ہے

لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے اس نفس کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مشقت اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ ڈٹ جائے کہ چاہے مشقت ہو یا تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، تب بھی یہ کام نہیں کروں گا، جس دن یہ شخص نفس کے سامنے اس طرح ڈٹ گیا، بس اس دن سے یہ نفسانی خواہش خود بخود ڈھیلی پڑنی شروع ہو جائے گی، یہ نفس اور شیطان کمزور کے اوپر شیر ہیں، جو اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہے اور اس کے تقاضوں پر چلتا رہے، اس کے اوپر یہ چھا جاتا ہے اور غالب آجاتا ہے، اور جو شخص ایک مرتبہ پختہ ارادہ کر کے اس کے سامنے ڈٹ گیا کہ میں یہ

کام نہیں کروں گا، چاہے کتنا تقاضہ ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، پھر یہ نفس ڈھیلا پڑ جاتا ہے، اور اس کام کے نہ کرنے پر پہلے دن جتنی تکلیف ہوئی تھی، دوسرے دن اس سے کم ہوگی، اور تیسرے دن اس سے کم، اور ہوتے ہوتے وہ تکلیف ایک دن بالکل رفع ہو جائے گی اور نفس اس کا عادی بن جائے گا۔

نفس دودھ پیتے بچے کی طرح

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، جن کا "قصیدہ بردہ" بہت مشہور ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے، اس میں انہوں نے ایک عجیب و غریب حکیمانہ شعر کہا ہے۔

النفس کا لطفل ان تهمله شبّ علی
حب الرضاع و ان تفطمه ینفطم

یہ انسان کا نفس ایک چھوٹے بچے کی طرح ہے جو ماں کا دودھ پیتا ہے، اور وہ بچہ دودھ پینے کا عادی بن گیا، اب اگر اس سے دودھ چھڑانے کی کوشش کرو تو وہ بچہ کیا کرے گا؟ روئے گا، چلائے گا، شور کرے گا۔ اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے سے بچے کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے، چلو چھوڑو، اسے دودھ پینے دو، اور وہ دودھ پیتا رہے۔ تو علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کو اس طرح دودھ پینے کی حالت میں چھوڑ دیا تو نتیجہ

یہ ہوگا کہ وہ جوان ہو جائے گا اور اس سے دودھ نہیں چھوٹ پائے گا۔ اس لئے کہ تم اس کی تکلیف، اس کی فریاد اور اس کی چیخ و پکار سے ڈر گئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دودھ نہیں چھڑا سکے، اب اگر اس کے سامنے روٹی لاتے ہیں، تو وہ کہتا ہے کہ میں تو نہیں کھاؤں گا، میں تو دودھ ہی پیؤں گا۔ لیکن دنیا میں کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہوں گے جو یہ کہیں کہ چونکہ بچے کو دودھ چھڑانے سے تکلیف ہو رہی ہے، اس لئے دودھ نہیں چھڑاتے۔ ماں باپ جانتے ہیں کہ دودھ چھڑانے سے روئے گا، چلائے گا، رات کو نیند نہیں آئے گی، خود بھی جاگے گا، ہمیں بھی جگائے گا، لیکن پھر بھی دودھ چھڑاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی بھلائی اسی میں ہے، اگر آج اس کو دودھ نہ چھڑایا گیا تو ساری عمر یہ کبھی روٹی کھانے کے لائق نہیں ہوگا۔

اس کو گناہوں کی چاٹ لگی ہوئی ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ انسان کا نفس بھی بچے کی مانند ہے، اس کے منہ کو گناہ لگے ہوئے ہیں، گناہوں کا ذائقہ اور اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے، اگر تم نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا کہ چلو کرنے دو، گناہ چھڑانے سے تکلیف ہوگی، نظر غلط جگہ پر پڑتی ہے اور اس کو ہٹانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، زبان کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر جھوٹ بولنا چھوڑیں گے تو بڑی تکلیف ہوگی۔ اور اس زبان کو مجلسوں کے اندر بیٹھ کر غیبت کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر اس کو روکیں گے تو بڑی دقّت ہوگی۔

نفس اِن باتوں کا عادی بن گیا ہے، رشوت لینے کی عادت پڑ گئی ہے، اللہ بچائے سود کھانے کی عادت پڑ گئی۔ اور بہت سے گناہوں کی عادت پڑ گئی ہے، اور اب ان عادتوں کو چھڑانے سے نفس کو تکلیف ہو رہی ہے، اگر نفس کی اس تکلیف سے گھبرا کر اور ڈر کر بیٹھ گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری عمر نہ کبھی گناہ چھوٹیں گے اور نہ قرار ملے گا۔

سکون اللہ کے ذکر میں ہے

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں قرار اور سکون نہیں ہے، ساری دنیا کے اسباب و وسائل جمع کر لئے، لیکن اس کے باوجود سکون نصیب نہیں، چین نہیں ملتا۔ مغربی معاشرے میں پیسے کی ریل پیل، تعلیم کا معیار بلند، لذت حاصل کرنے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں کہ جس طرح چاہو لذت حاصل کرلو، لیکن اس کے باوجود یہ حال ہے کہ خواب آور گولیاں کھا کھا کر اس کی مدد سے سو رہے ہیں۔ کیوں؟ دل میں سکون و قرار نہیں، سکون کیوں نہیں ملا؟ اس لئے کہ گناہوں میں سکون کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ یاد رکھو! ان گناہوں اور نافرمانیوں اور مصیبتوں میں سکون نہیں، سکون تو صرف ایک چیز میں ہے، اور وہ ہے:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

اللہ کی یاد میں اطمینان اور سکون ہے۔

(سورۃ الرعد، آیت ۲۰)

اس واسطے یہ سمجھنا دھوکہ ہے کہ نافرمانیاں کرتے جائیں گے اور سکون ملتا جائے گا۔ یاد رکھو! زندگی بھر نہیں ملے گا، اس دنیا سے تڑپ تڑپ کر جاؤ گے، اگر نافرمانیوں کو نہ چھوڑا تو سکون کی منزل حاصل نہ ہو گی۔

سکون اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں کو دیتے ہیں جن کے دل میں اس کی محبّت ہو، جن کے دل میں اس کی یاد ہو، جن کا دل ان کے ذکر سے آباد ہو۔ ان کے سکون اور اطمینان کو دیکھو کہ ظاہری طور پر پریشان حال بھی ہیں، فقر و فاقے بھی گزر رہے ہیں، لیکن دل کو سکون اور قرار کی نعمت میسّر ہے، لہٰذا اگر دنیا کا بھی سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان نافرمانیوں اور گناہوں کو تو چھوڑنا پڑے گا، اور گناہوں کو چھوڑنے کے لئے ذرا سا مجاہدہ کرنا پڑے گا، نفس کے مقابلے میں ذرا سا ڈٹنا پڑے گا۔

اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا

اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی فرمالیا کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو لوگ ہمارے راستے میں یہ مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں کہ ماحول کا، معاشرے کا، نفس کا، شیطان کا اور خواہشات کا تقاضہ چھوڑ کر وہ ہمارے حکم پر چلنا چاہتے ہیں، تو ہم کیا کرتے ہیں:

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "ہم ان کے

ہاتھ پکڑ کر لے چلیں گے" یہ نہیں کہ دور سے دکھادیا کہ یہ راستہ ہے، بلکہ فرمایا کہ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جائیں گے۔ لیکن ذرا کوئی قدم تو بڑھائے، ذرا کوئی ارادہ تو کرے، ذرا کوئی اپنے اس نفس کے مقابلے میں ایک مرتبہ ڈٹے تو سہی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، جو کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا "مجاہدہ" اسی کا نام ہے کہ ایک مرتبہ آدمی ڈٹ کر ارادہ کر لے کہ یہ کام نہیں کروں گا، دل پر آرے چل جائیں گے، خواہشات پامال ہو جائیں گی، دل و دماغ پر قیامت گزر جائے گی، لیکن یہ گناہ کا کام نہیں کروں گا، جس دن نفس کے سامنے ڈٹ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن سے ہمارا محبوب ہو گیا، اب ہم خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جائیں گے۔

اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

اس لئے اصلاح کے راستے میں سب سے پہلا قدم "مجاہدہ" ہے، اس کا عزم کرنا ہو گا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

جو آرزوئیں دل میں پیدا ہو رہی ہیں، وہ چاہے برباد ہو جائیں، چاہے

ان کا خون ہو جائے، اب میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب تو اس کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے، اب اس دل میں اللہ جلّ جلالہ کے انوار کا نزول ہوگا، اب اس دل میں اللہ تعالیٰ کی محبّت جاگزیں ہوگی، اب یہ گناہ نہیں ہوں گے۔ پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور آدمی اس راہ پر چل پڑتا ہے۔

یاد رکھو! شروع شروع میں تو یہ کام کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ دل تو کچھ چاہ رہا ہے، اور اللہ کی خاطر اس کام کو چھوڑتے ہیں، اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن بعد میں اس تکلیف میں ہی مزہ آنے لگتا ہے اور لطف آنے لگتا ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ میں نفس کو جو کچل رہا ہوں اور آرزوؤں کا جو خون کر رہا ہوں، یہ اپنے مالک اور خالق کی خاطر کر رہا ہوں، اس میں جو مزہ اور کیف ہے آپ ابھی اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

ماں یہ تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

ماں کو دیکھئے! اس کی کیا حالت ہوتی ہے کہ سخت سردی کا عالم ہے، اور کڑکڑاتے جاڑے کی رات ہے، لحاف میں لیٹی ہوئی ہے، اور بچہ پاس پڑا ہے، اس حالت میں اس بچے نے پیشاب کر دیا، اب نفس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ گرم گرم بستر چھوڑ کر کہاں جاؤں، یہ تو جاڑے کا موسم ہے، گرم گرم بستر چھوڑ کر جانا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن ماں یہ سوچتی ہے کہ اگر میں نہ گئی تو بچہ گیلا پڑا رہے گا، اس کے کپڑے گیلے ہیں، اس طرح گیلا پڑ رہے گا تو

کہیں اس کو بخار نہ ہو جائے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ وہ بے چاری اپنے نفس کا تقاضہ چھوڑ کر سخت کڑا کے کے جاڑے میں باہر جا کر ٹھنڈے پانی سے اس کے کپڑے دھو رہی ہے، اور اس کے کپڑے بدل رہی ہے، یہ کوئی معمولی مشقت ہے؟ معمولی تکلیف ہے؟ لیکن ماں یہ تکلیف برداشت کر رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اپنے بچے کی فلاح اور اس کی صحت ماں کے پیش نظر ہے، اس لئے وہ اس سخت جاڑے میں اپنے نفس کے تقاضے کو پامال کر کے یہ سارے کام کر رہی ہے۔

محبّت تکلیف کو ختم کر دیتی ہے

ایک عورت کا کوئی بچہ نہیں ہے، کوئی اولاد نہیں ہے، وہ کہتی ہے بھائی کسی طرح میرا علاج کراؤ تاکہ بچہ ہو جائے اور اولاد ہو جائے، اور اس کے لئے دعائیں کراتی پھر رہی ہے کہ دعا کرو اللہ میاں سے مجھے اولاد دے دے، اور اس کے لئے تعویذ گنڈے اور خدا جانے کیا کیا کراتی پھر رہی ہے، ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ ارے! تو کس چکر میں پڑی ہے؟ بچہ پیدا ہوگا تو تجھے بہت سی مشقتیں اٹھانی پڑیں گی، جاڑے کی راتوں میں اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھونے ہوں گے، تو وہ عورت جواب دیتی ہے کہ میرے ایک بچے پر ہزار جاڑوں کی راتیں قربان ہیں، اس لئے کہ اس بچے کی قدر و قیمت اور اس کے دولت ہونے کا احساس اس کے دل میں ہے، اس واسطے اس ماں کے لئے ساری تکلیفیں راحت بن گئیں۔ وہ ماں جو اللہ

سے مانگ رہی ہے کہ یا اللہ! مجھے اولاد دے دے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اولاد کی جتنی ذمہ داریاں ہیں، جتنی تکلیفیں ہیں، وہ دے دے، لیکن وہ تکلیفیں اس کی نظر میں تکلیفیں ہی نہیں بلکہ وہ راحت ہیں، اب جو ماں جاڑے کی رات میں اٹھ کر کپڑے دھو رہی ہے، اس کو طبعی طور پر تکلیف تو ضرور ہو رہی ہے، لیکن عقلی طور پر اسے اطمینان ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں، جب یہ اطمینان ہوتا ہے تو اس وقت اسے اپنی آرزوؤں کو کچلنے میں بھی لطف آنے لگتا ہے۔

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں:

از محبت تلخہا شیریں شود

کہ جب محبّت پیدا ہو جاتی ہے تو کڑوی سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی معلوم ہونے لگتی ہیں، جن کاموں میں تکلیف ہو رہی تھی، محبّت کی خاطر ان میں بھی مزہ آنے لگتا ہے، لطف آنے لگتا ہے کہ میں یہ کام محبّت کی وجہ سے کر رہا ہوں، محبّت کی خاطر کر رہا ہوں۔

مولیٰ کی محبّت لیلیٰ سے کم نہ ہو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں محبّت کی بڑی عجیب حکایتیں لکھی ہیں۔ لیلیٰ مجنون کا قصّہ لکھا ہے کہ مجنون لیلیٰ کی خاطر کس طرح دیوانہ بنا اور کیا کیا مشقتیں اٹھائیں، دودھ کی نہر نکالنے کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا اور کام شروع بھی کر دیا، یہ ساری مشقتیں اٹھا رہا ہے، کوئی اس سے کہے کہ

تو یہ جو کام کر رہا ہے، یہ بڑی مشقت کا کام ہے، اسے چھوڑ دے، تو وہ کہتا ہے کہ ہزار مشقتیں قربان، جس کی خاطر یہ کام کر رہا ہوں اس کی محبّت میں کر رہا ہوں، مجھے تو اسی نہر کھودنے میں مزہ آرہا ہے، اس لئے کہ یہ میں اپنی محبوب کی خاطر کر رہا ہوں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود

گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولیٰ کا عشق حقیقی کب لیلیٰ کے عشق سے کم ہو سکتا ہے، مولیٰ کے لئے گیند بن جانا زیادہ اولیٰ ہے۔ لہٰذا جب آدمی محبّت کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھاتا ہے تو پھر بڑا لطف آنے لگتا ہے۔

تنخواہ سے محبّت ہے

ایک آدمی ملازمت کرتا ہے، جس کے لئے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے، اچھی خاصی سردی میں بستر پر لیٹا ہوا ہے اور جانے کا وقت آگیا تو بستر چھوڑ کر جا رہا ہے، نفس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ گرم گرم بستر میں پڑا رہتا، لیکن گھر چھوڑ کر اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر جا رہا ہے، اور سارا دن محنت کی چکی پیسنے کے بعد رات کو کسی وقت گھر واپس آتا ہے۔ اور بیشمار لوگ ایسے بھی ہیں جو صبح اپنے بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر جاتے ہیں اور رات کو واپس آکر سوتا ہوا پاتے ہیں، غرض وہ شخص یہ سب تکلیفیں برداشت کر رہا ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ ارے بھائی! تم ملازمت میں بہت تکلیف اٹھا

رہے ہو، چلو میں تمہاری ملازمت چھڑا دیتا ہوں۔ وہ جواب دے گا: نہیں بھائی نہیں، بڑی مشکل سے تو یہ ملازمت لگی ہے، اس کو مت چھڑوانا۔ اس کو صبح سویرے اٹھ کر جانے میں ہی مزہ آرہا ہے، اور اولاد کو بیوی کو چھوڑ کر جانے میں بھی مزہ آرہا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اس محبت کے نتیجے میں یہ ساری تکلیفیں شیریں بن گئیں، اب اگر کسی وقت ملازمت چھوٹ گئی تو روتا پھر رہا ہے کہ ہائے وہ دن کہاں گئے جب صبح سویرے اٹھ کر جایا کرتا تھا، اور لوگوں سے سفارشیں کراتا پھر رہا ہے کہ مجھے ملازمت پر دوبارہ بحال کر دیا جائے۔ اگر محبّت کسی چیز سے ہو جائے تو اس راستے کی ساری تکلیفیں آسان اور مزے دار ہو جاتی ہیں، اسی میں لطف آنے لگتا ہے۔

اسی طرح گناہوں کو چھوڑنے میں تکلیف ضرور ہے، شروع میں مشقّت ہوگی، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ گئے اور شریعت کے مطابق عمل شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوگی، اور پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس تکلیف میں مزہ آنے لگے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مزہ آنے لگے گا۔

عبادت کی لذّت سے آشنا کردو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک مرتبہ بڑی عجیب و غریب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ انسان کے اس نفس کو لذت اور مزہ چاہئے، اس کی خوراک لذت اور مزہ ہے، لیکن لذت اور مزے کی

کوئی خاص شکل اس کو مطلوب نہیں کہ فلاں قسم کا مزہ چاہئے اور فلاں قسم کا نہیں چاہئے، بس اس کو تو مزہ چاہئے، اب تم نے اس کو خراب قسم کے مزے کا عادی بنادیا ہے، خراب قسم کی لذتوں کا عادی بنادیا ہے، ایک مرتبہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی لذت سے آشنا کردو، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی لذت سے آشنا کردو، پھر یہ نفس اسی میں لذت اور مزہ لینے لگے گا۔

مجھے تو دن رات بے خودی چاہئے

غالب کا ایک مشہور شعر ہے، خدا جانے لوگ اس کا کیا مطلب لیتے ہوں گے، لیکن ہمارے حضرتؒ نے اس کا بڑا اچھا مطلب نکالا ہے، وہ شعر ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

شراب سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں، مجھے تو دن رات لذت کی بے خودی چاہئے، تم نے مجھے شراب کا عادی بنادیا تو مجھے شراب میں بے خودی حاصل ہوگئی، شراب میں لذت آنے لگی، اگر تم مجھے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر اور اس کی اطاعت کا عادی بنادیتے تو یہ بے خودی مجھے اللہ کے ذکر میں حاصل ہو جاتی، میں تو اسی میں خوش ہو جاتا، لیکن یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے ان چیزوں کے بجائے شراب کا عادی بنادیا۔

نفس کو کچلنے میں مزہ آئے گا

اسی طرح یہ مجاہدہ شروع میں تو بڑا مشکل لگتا ہے کہ بڑا کٹھن سبق دیا جارہا ہے کہ اپنے نفس کی مخالفت کرو، اپنے نفس کی خواہشات کی خلاف ورزی کرو۔ نفس تو چاہ رہا ہے کہ غیبت کروں، مجلس میں غیبت کرنے کا موضوع چھڑ گیا، اب جی چاہ رہا ہے کہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لوں، اب اس وقت اس کو لگام دینا کہ نہیں، یہ کام مت کرو، یہ بڑا مشکل کام لگتا ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ دور دور سے یہ مشکل نظر آتا ہے، جب آدمی نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ یہ کام نہیں کروں گا، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور فضل و کرم سے مدد بھی ہوگی، اور پھر تم نے اس آرزو اور خواہش کو جو کچلا ہے، اس کچلنے میں جو مزہ آئے گا، انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس کی حلاوت اس غیبت کی لذت سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ایمان کی حلاوت حاصل کرلو

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کے دل میں تقاضہ پیدا ہوا کہ نگاہ غلط جگہ پر ڈالوں، اور کون شخص ہے جس کے دل میں یہ تقاضہ نہیں ہوتا، اب دل بڑا کسمسا رہا ہے کہ اس کو دیکھ ہی لوں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خشیت کے خیال سے نظر کو بچالیا اور نگاہ نہیں ڈالی، بڑی تکلیف ہوئی، دل پر آرے چل گئے، لیکن

اسی تکلیف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کے آگے دیکھنے کی لذت ہیچ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اور حدیث میں موجود ہے۔

(مسند احمد، جلد ۵ ص ۲۶۴)

یہ وعدہ صرف نگاہ کے گناہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر گناہ چھوڑنے پر یہ وعدہ ہے، مثلاً غیبت میں بڑا مزہ آرہا ہے، لیکن ایک مرتبہ آپ نے اللہ جل جلالہ کے خیال سے غیبت چھوڑ دی اور غیبت کرتے کرتے رک گئے، اللہ کے ڈر کے خیال سے غیبت کا کلمہ زبان پر آتے آتے رک گیا، پھر دیکھو کیسی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور جب انسان گناہوں کی لذتوں کے مقابلے میں اس لذت کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ تعلق مضبوط سے مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

حاصل تصوّف

حضرت حکیم الامّت قدس اللہ سرہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی، یاد رکھنے کے لائق ہے، فرمایا: "وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی اطاعت کے کرنے میں سستی پیدا ہو، مثلاً نماز کا وقت ہوگیا، لیکن نماز کو جانے میں سستی ہو رہی ہے، "اس سستی کا مقابلہ کرکے اس طاعت کو کرے، اور جب گناہ سے بچنے میں دل سستی کرے تو اس سستی کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچے" پھر فرمایا کہ: "بس اسی سے تعلق مع اللہ

پیدا ہوتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہوتی ہے۔ اور جس شخص کو یہ بات حاصل ہو جائے، اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا نفسانی خواہشات پر آرے چلا چلا کر اور ہتھوڑے مار مار کر جب اس کو کچل دیا، تو اب وہ نفس کچلنے کے نتیجے میں اللہ جل جلالہ کی تجلّی گاہ بن گیا۔

دل تو ہے ٹوٹنے کے لئے

ہمارے والد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک مثال دیا کرتے تھے۔ اب تو وہ زمانہ چلا گیا، پہلے زمانے میں یونانی حکیم ہوا کرتے تھے، وہ کشتہ بنایا کرتے تھے، سونے کا کشتہ، چاندی کا کشتہ، سنکھیا کا کشتہ، اور نہ جانے کیا کیا کشتے تیار کرتے تھے اور کشتہ بنانے کے لئے وہ سونے کو جلاتے تھے اور اتنا جلاتے تھے کہ وہ سونا راکھ بن جاتا تھا، اور کہتے تھے کہ سونے کو جتنا زیادہ جلایا جائے گا، اتنی ہی اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا، اب جلا جلا کر جب کشتہ تیار کیا تو وہ کشتہ طلا تیار ہوگیا، کوئی اس کو ذرا سا کھالے تو پتہ نہیں کہاں کی قوت آجائے گی، تو جب سونے کو جلا جلا کر مٹا مٹا کر پامال کر کر کے راکھ بنا دیا تو اب یہ کشتہ تیار ہوگیا۔ ہمارے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان خواہشات نفس کو جب کچلو گے اور کچل کچل کر پیس پیس کر راکھ بنا کر فنا کر دو گے، تب یہ کشتہ بن جائے گا، اس میں اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق کی قوت آجائے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آجائے گی، اب دل اللہ تعالیٰ کی تجلّی گاہ بن جائے گا، اس دل کو جتنا

توڑو گے، اتنا ہی یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بنے گا ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

تم اس پر جتنی چوٹیں لگاؤ گے، اتنا ہی یہ بنانے والے کی نگاہ میں محبوب ہو گا، بنانے والے نے اس کو اسی لئے بنایا ہے کہ اسے توڑا جائے، اس کی خاطر اس کی خواہشات کو کچلا جائے، اور جب وہ کچل جاتا ہے تو کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کیا اچھا شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

یہ کہہ کے کاسہ ساز نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

اور کچھ بنائیں گے، یعنی جو وہ چاہیں گے وہ بنائیں گے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ خواہشات نفس کو کچلنے سے جو چوٹیں لگ رہی ہیں، اور جو تکلیف ہو رہی ہے، وہ بے کار جا رہی ہیں، بلکہ اس کے بعد جب یہ دل اللہ تعالیٰ کی محبت کا محل بنے گا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کا محل بنے گا، اس وقت اس کو جو حلاوت نصیب ہو گی، خدا کی قسم اس کے مقابلے میں گناہوں کی یہ ساری لذتیں خاک در خاک ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم سب کو نصیب فرمائیں۔ بس! شروع میں تھوڑی سی محنت اور مشقت اٹھانی پڑے گی، اور اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسی بات کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا کہ:

المجاهد من جاهد نفسه

مجاہد در حقیقت وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، اپنے نفس کی خواہشات کو اللہ کی خاطر کچلے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنے نفس کی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونہ بننے سے بچائے، اور ان خواہشات نفس کو قابو کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۴

مجاہدہ مستحبہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲
مجلس نمبر : ۲۴
صفحات : ۱۵

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۴

مجاہدہ مستحبّہ

اور چار چیزوں میں قلّت

الحمدللّٰه ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علی رسوله الکریم، وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین، امابعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مجاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ معاصی کو تو مطلقاً ترک کرے اور یہ نفس کی مخالفت واجب ہے اور مباحات

میں تقلیلاً مخالفت کرے اور یہ مخالفت مستحب ہے۔ الخ

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے "مجاہدہ" کی حقیقت بیان فرمادی ہے۔ وہ ہے نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرنا، یہ مخالفت بعض حالات میں واجب ہوتی ہے، مثلاً اگر نفس کسی گناہ کی طرف بلا رہا ہے اور کسی گناہ کا تقاضہ پیدا کر رہا ہے، تو اس تقاضے کی مخالفت کر کے اس کو کچلنا اور مجاہدہ کرنا واجب ہے۔ اصل "مجاہدہ" یہی ہے۔

جائز کاموں سے رکنا بھی مجاہدہ ہے

لیکن چونکہ ہمارا نفس لذتوں کا، خواہشات کا اور راحتوں کا عادی ہو چکا ہے اور اتنا زیادہ عادی ہو چکا ہے کہ اگر اس کو اللہ کے راستے کی طرف اور شریعت کی طرف موڑنا چاہیں تو آسانی سے نہیں مڑتا، بلکہ دشواری پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس نفس کو رام کرنے کے لئے اور اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے تابع بنانے کے لئے اس کو بعض مباح اور جائز کاموں سے بھی روکنا پڑتا ہے، اس لئے کہ جب نفس کو جائز کاموں سے روکیں گے تو پھر اس کو لذتوں کو چھوڑنے کی عادت پڑے گی، اور پھر اس کے لئے ناجائز امور سے بچنا بھی آسان ہو جائے گا۔ صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو بھی "مجاہدہ" کہا جاتا ہے۔ یہ "مجاہدہ مستحبہ" ہے۔

مثلاً خوب پیٹ بھر کر کھانا کوئی گناہ کا کام نہیں، لیکن صوفیاء کرام

فرماتے ہیں کہ خوب پیٹ بھر کر مت کھاؤ، اس لئے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نفس غافل ہو جائے گا اور لذتوں کا خوگر ہو جائے گا، اس لئے نفس کو عادی بنانے کے لئے کھانے میں تھوڑی سی کمی کر دو، یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

جائز کاموں میں مجاہدہ کیوں؟

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ صوفیاء کرام بعض جائز کاموں سے بھی روک دیتے ہیں اور ان کو چھڑا دیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جائز قرار دیا ہے؟ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو اس کی مثال یہ ہے کہ یہ کتاب کا ورق ہے، اس ورق کو موڑو، موڑ دیا، اچھا اس کو سیدھا کرو، اب وہ ورق سیدھا نہیں ہوتا، بہت کوشش کر لی، لیکن وہ دوبارہ مڑ جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ورق کو مخالف سمت میں موڑ دو، یہ سیدھا ہو جائے گا، پھر فرمایا کہ یہ نفس کا کاغذ بھی گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے، معصیتوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اب اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کو دوسری طرف موڑ دو، اور تھوڑے سے مباحات بھی چھڑا دو، جس کے نتیجے میں یہ بالکل سیدھا ہو جائے گا اور راستے پر آ جائے گا، یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

چار مجاہدات

چنانچہ صوفیاء کرام کے یہاں چار چیزوں کا مجاہدہ کرانا مشہور ہے،
۱۔ تقلیل طعام، کم کھانا۔ ۲۔ تقلیل کلام، کم بولنا۔ ۳۔ تقلیل منام، کم سونا۔
۴۔ تقلیل الاختلاط مع الانام، لوگوں سے کم ملنا۔

کم کھانا

۱۔ تقلیل طعام، کم کھانا۔ پہلے زمانے میں صوفیاء کرام کم کھانے پر بڑے بڑے مجاہدے کرایا کرتے تھے، یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آ جاتی تھی، لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ یہ زمانہ اب اس قسم کے مجاہدوں کا نہیں ہے، اب تو لوگ ویسے ہی کمزور ہیں، اگر کھانا کم کر دیں گے تو اور بیماریاں آ جائیں گی، اور اس کے نتیجے میں کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے جو عبادت کرتا تھا، اس سے بھی محروم ہو جائے۔ اس لئے فرمایا کہ آج کے دور میں انسان ایک بات کی پابندی کر لے تو پھر تقلیل طعام کا مقصد حاصل ہو جائے گا، وہ یہ کہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو کھانا کھاتے وقت ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس وقت دل میں یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ اب مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ کچھ اور کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ بس جس وقت یہ تردد کا مرحلہ آئے، اس وقت کھانا چھوڑ دے، اس سے تقلیل طعام کا منشا پورا ہو جائے گا۔

اور یہ جو تردد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ یہ عقل اور نفس کے درمیان لڑائی ہوتی ہے، کیونکہ کھانا کھانے میں مزہ آرہا ہے، تو اب نفس یہ تقاضہ کر رہا ہے کہ اور کھانا کھا کر مزہ لے لے، اور عقل کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اب مزید کھانا مت کھا، اب مزید کھائے گا تو کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔ نفس اور عقل کے درمیان یہ لڑائی ہوتی ہے، اور اس لڑائی کا نام تردد ہے، لہٰذا ایسے موقع پر نفس کے تقاضے کو چھوڑ دو اور عقل کے تقاضے پر عمل کرلو۔

وزن بھی کم اور اللہ بھی راضی

یہ مضمون میں نے حضرت والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ سے اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار سنا، اور مواعظ میں بھی پڑھا، لیکن بعد میں ایک ماہر ڈاکٹر کا مضمون نظر سے گزرا، جس میں لکھا تھا کہ:

آج کل لوگ اپنے بدن کا وزن کم کرنے کے لئے طرح طرح کے نسخے استعمال کرتے ہیں، کسی نے روٹی چھوڑ دی، کسی نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو "ڈائیٹنگ" کہتے ہیں۔ یورپ میں اس کا بہت رواج ہے، یہ چیز وہاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسم کا وزن کم ہو جائے۔ اور خاص طور پر خواتین میں اس کا اتنا رواج ہے کہ گولیاں کھا کھا کر وزن کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور بعض اوقات

اس میں مر بھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر لکھتا ہے کہ میرے نزدیک وزن کم کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی نہ تو کسی وقت کا کھانا مستقل چھوڑے، نہ روٹی کم کرے، بلکہ ساری عمر اس کا معمول بنالے کہ جتنی بھوک ہے، اس سے تھوڑا سا کم کھاکر کھانا بند کردے۔ اس کے بعد اس ڈاکٹر نے بعینہٖ یہ بات لکھی ہے کہ جس وقت کھانا کھاتے ہوئے یہ تردد ہو جائے کہ کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں، اس وقت کھانا چھوڑ دے، جو شخص اس پر عمل کرے گا، اس کو کبھی بدن بڑھنے کی اور معدے کے خراب ہونے کی شکایت نہیں ہوگی اور نہ اس کو ڈائیٹنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہی بات حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کئی سال پہلے لکھ گئے تھے۔ اب چاہو تو وزن کم کرنے کی خاطر اس پر عمل کرلو اور چاہو تو اللہ کو راضی کرنے کی خاطر اس مشورے پر عمل کرلو، لیکن اگر نفس کے علاج کے طور پر اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ عمل کرو گے تو اس کام میں اجر و ثواب بھی ملے گا اور وزن بھی کم ہو جائے گا، اور اگر صرف وزن کم کرنے کی خاطر کرو گے تو شاید وزن تو کم ہو جائے گا، لیکن اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

نفس کو لذّت سے دور رکھا جائے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ہمارے لئے یہ عمل کتنا آسان کر

دیا، ورنہ پہلے زمانے میں تو صوفیاء کرام خدا جانے کیا کیا ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔ صوفیاء کرام کے یہاں لنگر ہوا کرتے تھے، اس لنگر کے اندر شوربا بنتا تھا، خانقاہ میں جو مریدین ہوا کرتے تھے، ان کو یہ حکم ہوتا تھا کہ جس کے پاس ایک پیالہ شوربے کا آئے تو وہ اس شوربے میں ایک پیالہ پانی ملائے اور پھر کھائے، تاکہ نفس کو لذت گیری کی قید سے آزاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان سے فاقے بھی کرواتے تھے۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا، اور آج کل کا زمانہ اور ہے، جیسے طب کے اندر زمانے کے بدلنے سے علاج کے طریقے بدل جاتے ہیں، اسی طرح حکیم الامّت قدس اللہ سرہ ہمارے زمانے کے لحاظ سے اور ہمارے مزاجوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نسخے تجویز کر گئے، تقلیل طعام کا یہ نسخہ ہمارے لئے تجویز کر گئے جس سے تقلیل طعام کا منشا حاصل ہو جائے گا۔

پیٹ بھرے کی مستیاں

پورا پیٹ بھر کر اس طرح کھانا کہ پیٹ کا کوئی حصہ خالی نہ رہے، اگرچہ فقہی اعتبار سے ناجائز نہیں، حرام نہیں، لیکن یہ انسان کے لئے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی بیماریوں کا سبب اور ذریعہ ہے، اس لئے کہ جتنی معصیتیں اور نافرمانیاں ہیں، وہ سب بھرے ہوئے پیٹ پر سوجھتی ہیں، اگر آدمی کا پیٹ بھرا ہوا نہ ہو تو یہ گناہ اور نافرمانیاں نہیں سوجھتیں، اس لئے حکم یہ ہے کہ پیٹ بھرے ہونے سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے۔ اسی کا نام "تقلیل طعام" کا مجاہدہ ہے۔

کم بولنا "ایک مجاہدہ" ہے

دوسری چیز ہے "تقلیل کلام" بات کم کرنا۔ یعنی صبح سے شام تک یہ ہماری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے، جو منہ میں آرہا ہے انسان بول رہا ہے، یہ صورت حال غلط ہے، اس لئے کہ جب تک انسان اس زبان کو لگام نہیں دے گا اور اس کو قابو نہیں کرے گا، اس وقت تک یہ گناہ کرتی رہے گی۔ یاد رکھئے! حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالنے والی چیز اس کی زبان ہے، اس لئے کہ جب زبان کو آزاد چھوڑ رکھا ہے، اس پر روک ٹوک نہیں ہے، تو پھر وہ زبان جھوٹ میں مبتلا ہوگی، غیبت میں مبتلا ہوگی، دل آزاری میں مبتلا ہوگی، ان گناہوں کے سبب وہ جہنم میں جائے گا۔

زبان کے گناہوں سے بچ جائے گا

اس لئے انسان کو "تقلیل کلام" کا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ بات کم کرے، زبان سے فضول بات نہ نکالے، ضرورت کے مطابق بات کرے، اور بولنے سے پہلے یہ سوچے کہ یہ بات کرنا میرے لئے مناسب ہے یا نہیں؟ کہیں گناہ کی بات تو نہیں، اور بلاوجہ زبان چلانے سے بچے، اس طرح آہستہ آہستہ انسان کم بولنے کا عادی ہو جاتا ہے، پھر یہ ہوتا ہے کہ بولنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا تو اس کے نتیجے میں

زبان پر قابو پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر وہ جھوٹ، غیبت اور اس طرح کے دوسرے گناہوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

جائز تفریح کی اجازت ہے

یہ جو فضول قسم کی مجلس آرائی ہوتی ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں گپ شپ کہا جاتا ہے، کوئی دوست مل گیا تو فوراً اس سے کہا کہ آؤ ذرا بیٹھ کر گپ شپ کریں، یہ گپ شپ لازماً انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ ہاں! شریعت نے ہمیں تھوڑی بہت تفریح کی بھی اجازت دی ہے، نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

روّحوا القلوب ساعةً فساعةً

(کنزالعمال، ۵۳۵۴)

یعنی دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام بھی دیا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جایئے کہ ہمارے مزاج، ہماری نفسیات اور ہماری ضروریات کو ان سے زیادہ پہنچاننے والا اور کون ہوگا، وہ جانتے ہیں کہ اگر ان سے کہا گیا کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ کچھ نہ کرو، ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہو، تو یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ فرشتے نہیں ہیں، یہ تو انسان ہیں، ان کو تھوڑے سے آرام کی بھی ضرورت ہے، تھوڑی سی تفریح کی بھی ضرورت ہے، اس لئے تفریح کے لئے کوئی بات کرنا، خوش طبعی کے ساتھ ہنس بول لینا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے، لیکن اس میں زیادہ منہمک

ہو جانا کہ اسی میں کئی کئی گھنٹے برباد ہو رہے ہیں، قیمتی اوقات ضائع ہو رہے ہیں، تو یہ چیز انسان کو لازمی طور پر گناہ کی طرف لیجانے والی ہے۔ اس لئے فرمایا جارہاہے کہ تم باتیں کم کرنے کی عادت ڈالو۔ اور یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

مہمان سے باتیں کرنا سنّت ہے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ باتیں بہت کرتے تھے، جب کبھی آتے تو بس ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے اور رکنے کا نام نہ لیتے، ہمارے سب بزرگوں کا یہ طریقہ رہاہے کہ اگر کوئی شخص مہمان بن کر ملنے کے لئے آتا تو اس کا اکرام کرتے، اس کی بات سنتے، اور حتی الامکان اس کی تشفی کی کوشش کرتے، یہ کام ایک مصروف آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے، جن لوگوں کی زندگی مصروفیات سے بھری ہو، وہ جان سکتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب آپ سے کوئی شخص ملنے کے لئے آتا، اور آپ سے بات کرنا شروع کرتا تو آپ ﷺ اس کی طرف سے کبھی منہ نہیں موڑتے تھے جب تک وہ خود ہی منہ نہ موڑلے، اس کی بات سنتے رہتے تھے، چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں کہ:

حتی یکون ہو المنصرف

(شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

حتی کہ وہ خود ہی نہ چلا جائے، یہ کام بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ بعض لوگ لمبی بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کی پوری بات پوری توجہ سے سننا ایک مشکل کام ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی وجہ سے ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ آنے والے کی بات سنتے اور اس کی تشفی کرتے۔

اصلاح کا ایک طریقہ

لیکن اگر کوئی شخص اصلاح کی غرض سے آتا تو اس پر روک ٹوک ہوتی تھی۔ بہر حال! وہ صاحب آکر باتیں شروع کر دیتے اور حضرت والد صاحب مسکینیت سے اس کی باتیں سنتے رہتے، ایک دن ان صاحب نے آکر حضرت والد صاحب سے بیعت کی درخواست کی کہ حضرت! میں آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے کوئی وظیفہ کوئی تسبیح بتا دیجئے، حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارے لئے کوئی تسبیح اور وظیفہ نہیں ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو، اس پر تالا ڈالو، تم جو ہر وقت بولتے رہتے ہو، زبان نہیں رکتی، یہ غلط ہے۔ آئندہ جب آؤ تو بالکل خاموش بیٹھے رہو، زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا۔ اب اس پابندی کے نتیجے میں ان صاحب پر قیامت گزر گئی، یہ خاموش بیٹھنے کا مجاہدہ ان کے لئے ہزار مجاہدوں سے بھاری تھا۔ اب یہ ہوتا کہ بار بار ان کے دل میں بولنے کا تقاضہ پیدا ہوتا، لیکن پابندی کی وجہ سے نہ بولنے پر مجبور تھے۔ اور اسی علاج کی وجہ

سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سارا طریق طے کرا دیا۔ اس لئے کہ حضرت والد صاحب یہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بنیادی بیماری یہ ہے، جب یہ قابو میں آجائے گی تو سب کام آسان ہو جائے گا، چنانچہ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہر ایک کی بیماری الگ الگ ہے، لہٰذا حالات کو دیکھ کر شیخ علاج تجویز کرتا ہے کہ اس کے لئے کونسا علاج مفید ہوگا، بہر حال یہ "تقلیل کلام" کا مجاہدہ ہے۔

کم سونا

تیسرا مجاہدہ ہے "تقلیل منام" یعنی کم سونا، اس میں بھی پہلے تو نہ سونے کا مجاہدہ ہوتا تھا، چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ کم سونے کی حد یہ ہے کہ آدمی کو دن رات میں کم از کم چھ گھنٹے ضرور سونا چاہئے، چھ گھنٹے سے کم نہ کرے، ورنہ بیمار ہو جائے گا۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو بے وقت سونے کی عادت ہے تو وہ اس کو ختم کرے، یہ بھی کم سونے کی حد میں داخل ہے، اور یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

لوگوں سے تعلقات کم رکھنا

چوتھا مجاہدہ ہے "تقلیل الاختلاط مع الانام" یعنی لوگوں سے میل جول کم کرنا، اور بہت زیادہ میل جول سے پرہیز کرنا، اس لئے کہ انسان کے

جتنے زیادہ تعلقات ہوں گے، اتنا ہی گناہوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لو، آج کل تو تعلقات بڑھانا باقاعدہ ایک فن اور ہنر بن گیا ہے، جس کو "پبلک ریلیشن" Public Relation کہا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ تعلقات زیادہ پیدا کرو، اور اپنا اثر ورسوخ بڑھاؤ، اور ان تعلقات کی بنیاد پر اپنا کام نکالو، لیکن ہمارے بزرگوں نے اس سے منع فرمایا ہے کہ بلاضرورت تعلقات نہ بڑھائے جائیں، بلکہ تعلقات کو کم کیا جائے۔

دل ایک آئینہ ہے

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کو ایک آئینہ بنایا ہے، جو تصویر انسان کے سامنے سے گزرتی ہے، اس کا عکس دل پر جم جاتا ہے، لہٰذا جب انسان کے تعلقات زیادہ ہوں گے تو اس میں پھر اچھے لوگ بھی آئیں گے اور برے بھی آئیں گے، اور جب برے کاموں میں مصروف لوگ ملاقات کریں گے تو ان کے کاموں کا عکس دل پر پڑے گا اور اس سے دل خراب ہوگا، اس لئے فرمایا کہ دوسرے لوگوں سے بلا ضرورت زیادہ نہ ملو، دوسرے لوگوں سے تعلقات جتنے کم ہوں گے، اتنا ہی اللہ جل شانہ سے تعلق میں اضافہ ہوگا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

تعلق حجاب است و بے حاصلی

چوں پیوندھا بگسلی واصلی

یعنی یہ تعلقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں حجاب اور پردے بن جاتے ہیں، دنیا کی جتنی محبتیں بڑھیں گی کہ اس سے بھی محبت ہے، اس سے بھی محبت ہے، اتنا ہی اللہ تبارک و تعالیٰ سے تعلق میں کمی آئے گی، البتہ جو حقوق العباد ہیں، وہ بے شک ادا کرنے ہیں، ان میں کوتاہی نہیں کرنی ہے، لیکن بلاوجہ تعلقات نہیں بڑھانا چاہئے، اسی کا نام "تقلیل الاختلاط مع الانام" ہے۔

بہرحال، یہ مجاہدات اس لئے کرائے جاتے ہیں تاکہ ہمارا یہ نفس قابو میں آجائے اور ناجائز کاموں پر اکسانا چھوڑ دے، اس لئے یہ مجاہدات ہر انسان کو کرنے چاہئیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ یہ مجاہدات کسی رہنما کی نگرانی میں کرے، خود اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے نہ کرے، اس لئے کہ اگر انسان خود سے یہ فیصلہ کرے گا کہ میں کتنا کھاؤں، کتنا نہ کھاؤں، کتنا سوؤں، کتنے لوگوں سے تعلقات رکھوں، کن لوگوں سے تعلقات نہ رکھوں تو اس میں بے اعتدالی ہو سکتی ہے، لیکن جب کسی رہنما کی رہنمائی میں یہ کام کرے گا تو انشاء اللہ اس کے فوائد حاصل ہوں گے اور ہر کام اعتدال میں رہ کر ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۵

مجاہدہ اختیاریہ واضطراریہ کا فرق

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/ ۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۵

صفحات : ۱۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۵

مجاہدہ اختیاریہ اور اضطراریہ کا فرق

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبۃ للمتقین۔
والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ وعلیٰ آلہ
واصحابہٖ اجمعین۔

أمّا بعد!

• حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:
مجاہدہ اختیاریہ میں تو فعل کا غلبہ ہے، اس لئے اس میں انوار زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ انوار کا ترتب عمل پر ہوتا ہے۔ اور مجاہدہ اضطراریہ میں فعل کم ہوتا ہے، اس لئے اس میں نورانیت کم ہوتی ہے، لیکن "انفعال" کا غلبہ ہوتا ہے، اس لئے قابلیت میں قوت بڑھتی ہے۔

اور اس انفعال اور قابلیت کی خود اعمال اختیاریہ کے
راسخ ہونے کے لئے سخت ضرورت ہے، اسی لئے
بزرگوں نے ایسے مجاہدات بہت زیادہ کرائے ہیں۔
(انفاس عیسیٰ ص ١٣)

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ "مجاہدہ" کے معنی ہیں "نفس کی مخالفت کرنا اور نفس کے تقاضوں کو اللہ کے لئے کچلنا۔ اس ملفوظ میں حضرت والا مجاہدہ کی دو قسمیں بیان فرمارہے ہیں: ایک مجاہدہ اختیاری، دوسرے مجاہدہ اضطراری۔

مجاہدہ اختیاری

مجاہدہ اختیاری یہ ہے کہ جب کسی طالب نے کسی شیخ کی طرف اپنی اصلاح کے لئے رجوع کیا تو اس شیخ نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اس طالب کو فلاں قسم کا مجاہدہ کرانا چاہئے، چنانچہ وہ شیخ اس طالب کو اس کام میں لگا دیتا ہے۔ جیسے شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے کا قصہ ہے کہ جب وہ اپنی اصلاح کے لئے اپنے باپ کے ایک اجازت یافتہ شیخ کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کو حمام جھونکنے پر لگا دیا، اب وہ حمام کی آگ جلا کر نمازیوں کے لئے پانی گرم کر رہے ہیں۔ یہ "مجاہدہ اختیاری" تھا، اس لئے کہ ان کا حمام جھونکنا کوئی ضروری نہیں تھا، لیکن شیخ نے ان کو اس کام پر لگا دیا۔ یا مثلاً کسی شیخ نے کسی طالب سے یہ کہہ دیا کہ تم روزانہ سو رکعت نفل پڑھا

کرو، تو یہ مجاہدہ اختیاری ہے، کیونکہ اپنے اختیار سے شیخ وہ کام اس طالب سے لے رہے ہیں۔

مجاہدہ اضطراری

دوسرا مجاہدہ اضطراری ہوتا ہے، جس میں انسان کے اپنے اختیار اور ارادے کو دخل نہیں ہوتا، لیکن غیر اختیاری طور پر حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کو اپنے نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، یا اس کو کوئی تکلیف یا کوئی صدمہ والی بات پیش آجاتی ہے، یا کسی بات کا غم لاحق ہو جاتا ہے، یہ سب "مجاہدہ اضطراریہ" ہیں۔ مثلاً کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا، اور اس کی وجہ سے صدمہ ہوا، اس میں بھی نفس کی مخالفت ہوئی، اس لئے کہ نفس تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ مزید زندہ رہتا، لیکن اس کا انتقال ہو گیا، تو یہ مجاہدہ اضطراری ہے۔ یا نفس تو چاہ رہا تھا کہ صحت اور تندرستی برقرار رہے، کوئی بیماری نہ آئے، لیکن کوئی بیماری لاحق ہوگئی جس کی وجہ سے تکلیف پہنچی، یہ "مجاہدہ اضطراری" ہے۔

بہرحال! ایک مجاہدہ وہ ہے جو انسان اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے، اس کے سامنے دو راستے کھلے ہوتے ہیں، چاہے وہ اس عمل کو کرے چاہے نہ کرے، یہ مجاہدہ اختیاری ہے۔ دوسرا مجاہدہ وہ ہے جو اپنے اختیار سے نہیں ہوتا، بلکہ حالات ایسے آجاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان کو غم، تکلیف اور صدمہ پہنچتا ہے، یہ مجاہدہ اضطراری ہے۔

مجاہدہ اختیاری اپنی مرضی سے نہ کرے

البتہ یہ مجاہدہ اختیاری خود اپنی رائے سے اور اپنی مرضی سے نہیں کرنا چاہئے، مثلاً آپ نے وعظ کے اندر یہ سن لیا کہ مجاہدہ ضرور کرنا چاہئے اور نفس کو کچلنا چاہئے، چنانچہ خود اپنی رائے سے یہ تجویز کرلیا کہ میں فلاں مجاہدہ کروں گا، یاد رکھئے کہ اپنی مرضی سے مجاہدہ کرنے سے اور زیادہ خرابی کا اندیشہ ہے، اس لئے مجاہدہ اختیاری ہمیشہ اپنے شیخ کی نگرانی اور اس کے حکم کے مطابق کرنا ضروری ہے، اپنی طرف سے نہ کرے۔ ہمارے دار العلوم میں بھی ایک مرتبہ بعض طلباء نے اپنی مرضی سے مجاہدہ کرنا شروع کر دیا، کسی نے یہ مجاہدہ اختیار کرلیا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا، کسی نے یہ اختیار کرلیا کہ میں صرف ایک کھجور سے افطار کروں گا، اس طرح کے مجاہدات کرنے شروع کر دیے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فائدہ ہونے کے بجائے الٹا نقصان ہوا۔ لہٰذا مجاہدہ اختیاریہ ہمیشہ کسی شیخ کی نگرانی میں کرنا چاہئے۔

مجاہدہ اختیاری میں نورانیت

بہرحال! مجاھدہ اختیاریہ ہو یا اضطراریہ، دونوں سے ترقی ہوتی ہے، اور دونوں کے ذریعہ طالب اللہ تعالیٰ کی رضا کی منزل کے قریب پہنچتا ہے۔ البتہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے دونوں مجاہدوں کا فرق بیان فرمایا ہے، فرمایا کہ مجاہدہ اختیاریہ چونکہ انسان اپنے فعل اور اپنے اختیار سے انجام دیتا

ہے اور اپنے اختیار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے نفس کو کچلتا ہے، اس وجہ سے اس مجاہدہ میں نورانیت زیادہ محسوس ہوتی ہے، انوار زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ اور "مجاہدہ اضطراریہ" میں اس نے اپنے اختیار سے کچھ نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے خود بخود حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ اس کی وجہ سے اس کو صدمہ اور تکلیف اور غم پہنچا، اس لئے اس مجاہدہ میں ظاہری اعتبار سے نورانیت کم ہوتی ہے، کیونکہ نورانیت کے نتیجے میں انسان کی طبیعت میں انشراح اور انبساط ہوتا ہے، جبکہ مجاہدہ اضطراریہ میں تو صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے، اس لئے اس مجاہدہ میں اس قسم کی نورانیت تو حاصل نہیں ہوتی۔

مجاہدہ اضطراریہ سے قابلیت پیدا ہونا

لیکن چونکہ یہ مجاہدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس وجہ سے اس مجاہدہ کے نتیجے میں انسان کے اندر قابلیت زیادہ پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اچھے اعمال کی قابلیت پیدا فرمادیتے ہیں۔ اس کی وجہ حضرت والا نے یہ بیان فرمائی کہ مجاہدہ اختیاریہ کے اندر "فعل" ہے اور مجاہدہ اضطراریہ کے اندر "انفعال" ہے، "انفعال" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے فعل کو دخل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فعل کا انفعال اور اثر ہے، اور "انفعال" کے نتیجے میں اس کے اندر قابلیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، البتہ دونوں مجاہدے فائدے سے خالی نہیں۔

مجاہدہ اضطراری میں ترقی تیزی سے ہوتی ہے

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے سنا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو مجاہدہ اختیاری اور اضطراری دونوں مفید اور کار آمد ہیں، لیکن ترقی جتنی تیزی سے مجاہدہ اضطراری میں ہوتی ہے، مجاہدہ اختیاری میں نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ مجاہدہ اضطراری کو تم نے خود اپنی مرضی سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ جل شانہ کی تجویز اور اختیار سے ہوا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان حالات سے گزارا، جب تم نے ان حالات پر صبر کیا، ان کو قبول کیا اور ان پر تفویض سے کام لیا، تو اس کے نتیجے میں ترقی بہت تیزی سے ہوتی ہے، البتہ بظاہر دیکھنے میں اس کے اندر نورانیت نظر نہیں آتی۔

فرض کریں کہ ایک شخص اپنے اختیار سے نوافل پڑھ رہا ہے اور مجاہدہ کر رہا ہے، اور ساری رات نوافل پڑھتے ہوئے گزار رہا ہے، جب اس نے یہ مجاہدہ کیا تو اس کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں انبساط اور انشراح اور سرور پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نیک کام کی توفیق دی۔ دوسری طرف وہ شخص ہے جس کو کسی عزیز کے انتقال کی خبر ملی ہو، یا کسی نے اس کو ڈانٹ پلا دی ہو، یا کسی نے اس کو کوئی اور دکھ اور تکلیف پہنچادی ہو، ایسے شخص کو تکلیف اور صدمہ ہو رہا ہے، تو اس کو اس عمل میں نورانیت اور مزہ کیسے آئے گا؟ لیکن اللہ جل شانہ اپنے فضل سے اس کی ترقی فرما رہے ہیں تاکہ وہ

کسی طرح اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

مجاہدہ اضطراریہ میں صبر داخل ہے

وجہ اس کی یہ کہ ہے مجاہدات اضطراریہ صبر کا تقاضہ کرتے ہیں کہ انسان ان تکلیفوں پر صبر کرے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے، اور جب صبر کرے گا تو صبر کرنے والوں کے لئے وعدہ ہے کہ:

اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ

یعنی اور اعمال کا اجر تو حساب کے ذریعہ دیا جائے گا اور صبر کرنے والوں کو بلا حساب اجر دیا جائے گا۔ بہر حال! اس مجاہدہ اضطراریہ سے بعض اوقات ترقیات بہت تیزی سے ہو جاتی ہیں۔

مجاہدہ اضطراریہ میں وساوس کا احتمال نہیں

مجاہدہ اختیاریہ کرنے والے کو یہ خیال بھی ہونے لگتا ہے کہ میں مجاہدہ کر رہا ہوں، اور پھر جب اس میں سرور اور نورانیت معلوم ہوتی ہے تو اس سے مزہ بھی آتا ہے، جس کی وجہ سے اس مجاہدہ میں وساوس (نفس و شیطان کی فریب کاریوں) کا احتمال بھی رہتا ہے، لیکن مجاہدہ اضطراریہ میں یہ وساوس نہیں ہوتے، اس لئے انسان مجاہدہ اضطراریہ سے سیدھا منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے اپنی طرف سے مجاہدہ اضطراریہ طلب نہ کرے، بیماری اور تکلیف اور صدمہ اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے، بلکہ یہ دعا کرے

کہ یا اللہ! میں بیماری اور تکلیف سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن جب بیماری آ جائے، یا کوئی اور تکلیف یا مصیبت آ جائے تو اس وقت صبر کرے، اور یہ سوچے کہ یہ مجاہدہ اضطراری کرایا جارہا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ترقی دینا چاہتے ہیں۔

تکلیف اور پریشانی کے وقت مجاہدہ اضطراری کو سوچنا

اس دنیا میں انسان کو جتنے صدمے پیش آتے ہیں، ان صدموں کے وقت اگر انسان ذرا خیال کرلیا کرے کہ تکلیف اور صدمہ تو مجھے پہنچ گیا، لیکن یہ مجاہدہ اضطراری ہو رہا ہے، اور مجاہدہ اختیاری کرنے کی تو مجھے توفیق ہوتی نہیں کہ مجاہدہ اختیاری کر کے کوئی ترقی حاصل کروں، اس کا موقع مجھے نہیں ملتا، میرا نفس مجھے یہ مجاہدہ نہیں کرنے دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مجاہدہ اضطراری کے اندر لگا دیا، اور اس کے ذریعہ نہ جانے میرے کتنے گناہ معاف ہو رہے ہیں، کتنے درجات بلند ہو رہے ہیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو رہا ہے۔ علماء کرام نے فرمایا کہ صبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا جتنا قرب حاصل ہوتا ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اس لئے جب بھی کوئی صدمہ، پریشانی اور تکلیف آئے تو اس وقت انسان یہ سوچ لے کہ یہ مجاہدہ اضطراری ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کے اندر میرا فائدہ ہے اور میری ترقی ہو رہی ہے، اس کو سوچنے سے انشاء اللہ وہ تکلیف اور غم بھی ہلکا ہو جائے گا اور منجانب اللہ جو ترقی ہونی ہے وہ بھی ہوگی۔

میرا ایک واقعہ

جب ''وفاقی شرعی عدالت'' میں میرا تقرر ہوا، تو عارضی طور پر مجھے دارالعلوم چھوڑ کر اسلام آباد جانا پڑا، جانے کی مرضی نہیں تھی، چنانچہ رمضان اور شعبان کی چھٹیوں میں تقریباً ڈیڑھ مہینہ وہاں گزارا، اس سے پہلے کبھی اتنے عرصہ تک دارالعلوم چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لئے اس سفر سے مجھے بہت اذیت ہوئی، اور ایک ایک لمحہ وہاں گزارنا مشکل ہوگیا۔ یہ ساری صورت حال میں نے اپنے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھ کر بھیجی۔ جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

> یہ سب مجاہدہ اضطراری ہو رہا ہے، فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا، انشاء اللہ۔

بعد میں جب حضرت والا سے ملاقات ہوئی تو حضرت والا نے فرمایا کہ دیکھیں: مجاہدہ اضطراری اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی نہیں چاہتا کہ وہ کام ہو، مگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تخلیق سے وہ کام ہو جاتا ہے، اگر اس پر انسان صابر رہے اور راضی برضا رہے تو اس مجاہدہ اضطراری سے بعض اوقات انسان کی ترقی بہت تیز رفتاری سے ہوتی ہے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ سے مصیبت، تکلیف اور غم اور صدمہ نہ مانگے، بلکہ ان چیزوں سے پناہ مانگے، لیکن جب یہ چیزیں آجائیں تو اس وقت یہ سوچے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میرے درجات بلند

فرمانا چاہتے ہیں۔

مجاہدہ اضطراریہ کا نفع

آگے ارشاد فرمایا کہ:

"مجاہدہ اضطراریہ" سے عمل میں قلّت بھی ہو جائے اور محض فرائض و واجبات ہی پر اکتفاء ہوتا رہے تب بھی مجاہدہ کاملہ کا ثواب ملتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

مثلاً مجاہدہ اضطراریہ میں کوئی صدمہ آگیا، کوئی پریشانی لاحق ہوگئی، اس صدمہ اور پریشانی کی وجہ سے نوافل وغیرہ کے معمولات چھوٹ گئے اور صرف فرائض و واجبات پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے، تو بظاہر معمولات کے چھوٹنے اور نوافل کے کم ہونے کی وجہ سے عمل میں قلت ہوئی، لیکن اللہ جل جلالہ اس مجاہدہ اضطراریہ کی برکت سے مجاہدہ کاملہ کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

معمولات چھوٹنے کے باوجود پورا ثواب

مثلاً گھر میں والدین میں کوئی بیمار ہوگیا، اب ان کی تیمارداری میں وقت گزر رہا ہے اور تلاوت کا موقع نہیں مل رہا ہے، تسبیح پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے، ایسے موقع پر بعض اوقات بہت صدمہ ہوتا ہے کہ اس کام

میں لگنے کی وجہ سے ہماری تلاوت چھوٹ گئی اور ہمارے معمولات چھوٹ گئے۔ اس پر حضرت فرمارہے ہیں کہ یہ بات دل سے نکال دو، کیوں؟ اس لئے کہ یہ جو تکلیف تم پر آئی ہے، اس نے تم سے یہ عبادت چھڑائی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے تم کو محروم نہیں کریں گے، بلکہ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اور زیادہ عطا فرمادیں۔

وقت کے تقاضے کو دیکھو

بس دین کی صحیح فہم یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ کس وقت کا کیا تقاضہ ہے؟ اس وقت میں وہ کام انجام دے۔ ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنا شوق پورا کرنے کا نام "دین" نہیں، کسی شخص کو کسی چیز کا شوق ہو جاتا ہے، کسی کو کسی چیز کا شوق ہو جاتا ہے، بس اب شوق کو پورا کر رہے ہیں۔ "دین" اس کا نام نہیں، بلکہ دین نام ہے "اتباع" کا، کہ اس وقت میں مجھ سے کیا تقاضہ ہو رہا ہے؟ اس تقاضے کو انجام دوں۔ بس یہ دین ہے۔

مفتی بننے کا شوق

ایک طالب علم میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھے "درجہ تخصص" میں داخل ہونے کا بڑا شوق ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ والدین کی کیا مرضی ہے؟ اس نے کہا والدین کا کہنا یہ ہے کہ نہ پڑھو، وہ تو منع کرتے ہیں، لیکن

مجھے بڑا شوق ہے، اگر میں نے نہیں پڑھا تو میرا یہ شوق پورا نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ والدین کی اطاعت واجب ہے اور مفتی بننا کوئی واجب اور فرض عین نہیں، اگر والدین پڑھانا نہیں چاہتے، بلکہ وہ اپنی ضرورت و مصلحت سے کسی ایسے مشغلے میں لگانا چاہتے ہیں جو مباح ہے، حرام اور ناجائز نہیں ہے، تو اس صورت میں والدین کے حکم کی تعمیل واجب ہے، مفتی بننا واجب نہیں۔

یا مثلاً والدین بیمار پڑے ہیں، ان کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے، لیکن آپ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اس طلب علم میں گھر سے نکل گئے جو فرض عین نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے، جیسے پورا عالم بننا اور "شہادت عالمیہ" حاصل کرنا فرض عین نہیں، اگر والدین بیمار ہیں اور ان کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے تو پھر وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی خدمت کرو اور دین کی صرف ضروری معلومات حاصل کرلو۔

تبلیغ یا جہاد کا شوق

یا مثلاً جہاد میں جانے کا شوق ہوگیا، اب اس کی فکر نہیں ہے کہ والدین اجازت دے رہے ہیں یا نہیں، حالات اس کے لئے سازگار ہیں یا نہیں، اور میرے لئے اس وقت کونسی بات زیادہ مناسب ہے، اس کی کوئی فکر نہیں، بس جہاد کے لئے چل پڑے۔ یا مثلاً تبلیغ میں جانے کا اور چلہ لگانے کا شوق ہوگیا، اب گھر میں ماں باپ بیمار ہیں یا بیوی بیمار ہے، اس کی کوئی پروا نہیں، یہ دین پر عمل نہ ہوا، یہ تو اپنا شوق پورا کرنا ہوا، اس لئے کہ

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں۔ لہٰذا یہ دیکھو کہ کس وقت شریعت کا کیا تقاضہ ہے، اس تقاضہ کو پورا کرو۔ انہی باتوں کی وجہ سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ ہمیں مفتی بننے نہیں دیتا، یہ جہاد کرنے نہیں دیتا، یہ تبلیغ کا دشمن ہے۔

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے

خوب سمجھ لیں کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، ہر وقت کا ایک تقاضہ ہوتا ہے، اگر اس وقت میں وہ کام کریں گے تو وہ کار ثواب ہوگا اور بڑی فضیلت کا باعث ہوگا، اور اگر اس کام کو بے وقت اور بے محل انجام دیا جائے گا تو وہ غلو ہے اور دین سے خارج ہے، وہ محض اپنا شوق پورا کرنا ہے، وہ تبلیغ نہیں ہے، بس اپنا شوق ہے، وہ دین کا کام نہیں۔ دین تو یہ ہے کہ یہ دیکھو اس وقت کا شرعی تقاضہ کیا ہے؟

معمولات چھوٹنے پر صدمہ مت کرو

اگر والدین بیمار ہیں اور ان کی خدمت کی وجہ سے تلاوت چھوٹ گئی، تسبیحات چھوٹ گئیں، یا بیوی بیمار ہے، اس کی خدمت کی وجہ سے یہ چیزیں چھوٹ گئیں، تو ان کے چھوٹنے پر کوئی صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس وقت کا شرعی تقاضہ ہی ان کی خدمت کرنا تھا، لہٰذا ان شاء اللہ تلاوت اور تسبیحات کا پورا اجر ملے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دین کی صحیح فہم فرمائے اور اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ٢٦

اللہ تک پہنچنے کے راستے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
١٨٨/١۔ لیاقت آباد، کراچی ١٩

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۶

صفحات : ۱۶

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

مجلس نمبر ۲۶

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبّ العالمين ۔ والعاقبة للمتقين ۔
والصّلاة والسّلام على رسوله الكريم ۔ وعلى
آله وأصحابه اجمعين ۔

أمّا بعد!

حضرت والا نے فرمایا:

طرق الوصول الى الله تعالىٰ بعدد انفاس
الخلائق ۔ جس طرح وصول کی ایک صورت یہ ہے
کہ حرم میں نماز پڑھو، یہ بھی ایک صورت ہے کہ کسی
عذر سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

بزرگوں کا یہ مقولہ عربی زبان میں مشہور ہے کہ "طرق الوصول الی اللّٰہ تعالیٰ بعدد انفاس الخلائق" اللہ جل شانہ تک پہنچنے کے طریقے اتنے ہی ہیں جتنے مخلوقات کے سانس (یعنی جس طرح ہر انسان کا سانس الگ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے بھی الگ ہیں، ہر انسان کو ایک ہی لگا بندھا طریقہ بتانا مشکل ہے)

یعنی تمام انسانوں کے لئے کوئی ایک ہی ذریعہ لازم نہیں ہے، سینکڑوں ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے وصول کے لئے پیدا فرما رکھے ہیں، اگر ایک انسان کو حرم شریف کی حاضری کا موقع نصیب ہے تو وہ اس حاضری سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اور جسے اس کا موقع نہیں ملا تو وہ خود کو محروم نہ سمجھے، اس کے لئے حرم کی حاضری کا شوق اور حسرت ہی ذریعہ تقرب بن سکتی ہے۔

فرائض و واجبات ادا کرنا، اور معاصی اور گناہوں سے اجتناب کرنا، یہ وہ چیز ہے جو سب کے لئے مشترک ہے، لیکن اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچنے کے لئے ہر ایک کے لئے الگ الگ نسخے تجویز کئے جاتے ہیں، اس کے لئے کسی رہبر اور رہنما اور شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ اس شخص کے لئے مناسب طریقہ کونسا ہے؟

عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنا

اسی بات کو حضرت والا نے ایک مثال سے سمجھایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ایک راستہ یہ ہے کہ حرم میں نماز پڑھو، اسی طرح ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو۔ فرمایا کہ وصول دونوں صورتوں میں ہے، حرم میں نماز پڑھنے میں بھی وصول ہے، اور عذر کی حالت میں گھر میں نماز پڑھ رہا ہے اور حرم کو ترس رہا ہے، یہ بھی وصول ہے۔ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنے والا یہ نہ سمجھے کہ میرا راستہ الگ ہو گیا ہے، بلکہ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہی ہے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ للّٰہ یُحِب أن تؤتی رخصه کمایحب أن تؤتی عزائمه۔ (کنز العمال، حدیث نمبر ۵۳۳۴)

اللہ تعالیٰ اپنی رخصتوں پر عمل کرنے کو اسی طرح پسند فرماتے ہیں جس طرح عزیمت پر عمل کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صرف عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں ہی "وصول" نصیب ہو گا، بلکہ رخصت پر عمل کرنے سے بھی "وصول" کی نعمت سے سرفراز ہو جائے گا۔ اگر جائز عذر ہے اور شریعت کے مطابق ہے اور اس پر واقعی اطمینان ہے کہ یہ عذر کی حالت ہے تو اس وقت رخصت پر عمل کرنے میں بھی انشاء اللہ

وہی ثواب اور انوار و برکات حاصل ہوں گے جو عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں۔

قضاء کے وقت وہی انوار و برکات

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رمضان المبارک میں کسی عذر شرعی کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا، (مثلاً بیماری کی وجہ سے، یا خواتین کی طبعی مجبوری کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا) تو کوئی نقصان نہیں، اس لئے کہ جب تم عام دنوں میں اس روزے کی قضاء کرو گے تو اس دن وہ سارے انوار و برکات حاصل ہوں گے جو رمضان المبارک کے انوار و برکات تھے، کیونکہ ہم نے تم کو اس دن روزہ رکھنے سے معذور کر دیا تھا، تو کیا اس کی وجہ سے ہم تم کو رمضان کی فضیلت سے اور رمضان کی برکات اور آثار سے محروم کر دیں گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اچھی امید نہ ہوئی، بلکہ امید یہی رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس قضاء کے اندر وہی برکات اور وہی اجر و ثواب عطا کریں گے۔

دین "اتباع" کا نام ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ سارا دین "اِتباع" کے گرد گھومتا ہے، جیسے وہ کہیں ویسے کرو، اپنی عقل مت چلاؤ۔

چوں کہ بر میخت بہ بندد بستہ باش

چوں کشاید چابک و برجستہ باش

جب تک انہوں نے باندھ رکھا ہے تو تم بھی بندھے پڑے رہو، جب وہ کھول دیں تو خوب چھلانگیں لگاؤ۔

اس لئے اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، اسی حال میں خوش رہو۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لہٰذا جس حال کی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے بس اسی میں راضی رہو۔

اتباع اور تفویض اختیار کرلو

بس دو چیزیں اختیار کرلو: ایک "اتباع" دوسرے "تفویض"۔ اوامر و نواہی میں "اتباع" ہو اور حالات میں "تفویض" ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امر آرہا ہے اس کی اتباع کریں، جو نہی آرہی ہے اس کی اتباع کریں، اور دنیا میں جو حالات پیش آرہے ہیں اس میں "تفویض" اختیار کریں، تفویض کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا، اللہ پر بھروسہ کرنا کہ جو کچھ انجام ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوگا اور خیر ہی ہوگا، اگر یہ دو چیزیں حاصل ہوجائیں بس سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہوگیا۔

نیک کام کی حسرت

اس ملفوظ کے آخر میں فرمایا کہ "عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو"۔ یہ ترسنا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، یعنی انسان کسی وجہ سے کوئی نیک عمل نہیں کرپایا، لیکن دل میں اس کے نہ کرنے کی حسرت ہو رہی ہے کہ کاش میرے اندر ایسی طاقت ہوتی اور میں بھی یہ نیک کام کرلیتا، یا میرے حالات ایسے ہوتے کہ میں اس فضیلت کو حاصل کرلیتا۔ یہ "حسرت" بھی بعض اوقات انسان کو بہت بلندی تک پہنچا دیتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور لوہار کا قصہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا، بڑے اونچے درجے عطا فرمائے، لیکن ہمارے گھر کے سامنے جو لوہار رہتا تھا، اس کو جو درجہ ملا وہ درجہ ہمیں نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اتنے بڑے بزرگ، محدّث، فقیہ، صوفی، اللہ کے خاص نیک بندے تھے، اس کے باوجود ان کا درجہ لوہار کا سا درجہ نہ ہوا۔ لوگوں نے جاکر لوہار کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارے شوہر میں کیا ایسی خاص بات تھی جس کے نتیجے میں وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا اور حضرت

عبداللہ بن مبارکؒ اس کے درجے پر حسرت کر رہے ہیں؟ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ کوئی خاص عمل تو نہیں کرتا تھا، سارا دن لوہا پیٹتا رہتا تھا، البتہ اس کے اندر دو باتیں تھیں، ایک یہ کہ جب اذان کی آواز اس کے کان میں آجاتی تو فوراً اپنا کام بند کر دیتا تھا، حتی کہ اگر ہتوڑا مارنے کے لئے سر پر اٹھایا ہوا ہے، اسی وقت اذان کی آواز کان میں پڑی تو اس ہتوڑے سے چوٹ مارنا گوارا نہیں کرتا تھا، اس اٹھے ہوئے ہتوڑے کو پیچھے کی طرف ہی پھینک دیتا تھا اور اٹھ کر نماز کے لئے مسجد چلا جاتا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ ہمارے گھر کے سامنے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے، وہ اپنے مکان کی چھت پر رات کو اس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے جس طرح لکڑی کھڑی ہوئی ہو، میرا شوہر ان کو دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو معاش سے فراغت عطا فرمائی ہے، اس کے نتیجے میں ساری رات کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں، اگر ہمیں بھی فراغت ہوتی تو ہم بھی رات کو کچھ عبادت کر لیا کرتے، لیکن معاش کی فکر کی وجہ سے سارا دن لوہا کوٹنے میں گزر جاتا ہے، پھر تھکاوٹ کی وجہ سے رات کو جاگنے کی ہمت نہیں ہوتی، ورنہ ہم بھی تہجد کی کچھ رکعتیں پڑھ لیا کرتے۔ یہ حسرت کیا کرتے تھے، لوگوں نے یہ سن کر کہا کہ بس یہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ درجہ عطا فرمایا جو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب نہ ہوا۔ بہر حال یہ حسرت بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

جسم وطن میں اور دل حرم میں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جسم ہندوستان میں ہو اور دِل حرم شریف میں ہو، یہ بہتر ہے اس سے کہ جسم حرم شریف میں ہو اور دِل ہندوستان میں ہو۔ یعنی جسم تو یہاں ہے اور دل میں خواہش ہو رہی ہے کہ کاش ہم بھی حرمین شریفین کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہوتے، کاش کہ ہمیں بھی وہاں جانے کا موقع مل جائے تو ہم بھی وہاں پہنچ جائیں، یہ جذبہ، یہ خواہش، یہ حسرت، یہ تمنا دل میں ہے اور جسم اپنے وطن میں ہے،یہ صورت بہتر ہے اس سے کہ آدمی حرم میں بیٹھا ہوا ہے اور اپنے وطن کو یاد کر رہا ہے۔

حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت مدینہ

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے بزرگوں میں سے گزرے ہیں، یہ ہجرت کر کے مدینہ طیّبہ چلے گئے تھے۔ آج کل تو ہجرت کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ آج لوگ پیسے کمانے کے لئے ہجرت کرتے ہیں، کیونکہ وہاں پیسے بہت ملتے ہیں۔ اصل ہجرت تو اس زمانے کی تھی جب وہاں پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہجرت ہوتی تھی۔ بہر حال! آپ نے اس طرح ہجرت فرمائی کہ ایک عرصے تک وہاں اس حال میں رہے کہ آپ

کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ وہ وقت آپ نے کس طرح گزارا ہوگا؟

چنانچہ خود اپنا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب میں پہلی مرتبہ مدینہ منورہ گیا تو وہاں کسی سے جان پہچان تو تھی نہیں، ایک کمرے میں جو تنگ و تاریک تھا، قیام کیا، وہاں مجھے بخار آگیا، اب وہاں پر نہ کوئی آنے والا نہ جانے والا، نہ مجھے کوئی دیکھنے والا، شدید بخار میں مبتلا، اور تین دن مجھ پر اس طرح گزرے کہ ایک دانہ بھی میرے منہ میں نہیں گیا، شدید بخار کی وجہ سے خود اٹھ کر بھی حرم نہیں جاسکتا تھا، کمزوری کی وجہ سے وہاں پر نماز پڑھنا مشکل ہو رہا تھا، تین دن کے بعد ایک شخص میرا نام "بدر عالم" "بدر عالم" پکارتا ہوا آیا، اپنے ساتھ کچھ دوا اور کھانا بھی لایا۔ حضرت مولانا نے اس شخص سے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میرا نام "بدر عالم" ہے اور میں یہاں پر ہوں؟ اس شخص نے بتایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا اور خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ ﷺ نے یہ نام بتایا اور کہا کہ جاکر ان کو دیکھو، وہ فلاں جگہ پر بیمار پڑا ہوا ہے، اور اس کی خبر گیری کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

مدینہ میں رہتے ہوئے خارج مدینہ کی ضرورت

بہرحال! جب حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے تو ان کے پاس حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ

اللہ علیہ نے خط لکھا، اس خط میں حضرت مفتی صاحب نے ایک جملہ یہ لکھ دیا کہ ”آپ کو یہاں کی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلّف مجھے ارشاد فرمادیں، میں وہ چیز بھیجنے کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔“ حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس جملے کے جواب میں لکھا کہ:

مدینہ میں رہتے ہوئے خارج مدینہ کی ضرورت!!

اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا۔

یعنی میں مدینہ میں رہتے ہوئے بھی اب اس بات کی فکر کروں کہ فلاں چیز فلاں جگہ ملتی ہے، یہ چیز وہاں سے منگواؤں، اس بات کو میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔

اور ”اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا“ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جا رہا تھا تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر میری کچھ ضرورت ہو تو میں کچھ مدد کروں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا۔

آپ کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، ہاں مجھے اللہ جل جلالہ کی رحمت اور کرم کی ضرورت ہے، میں اس کا محتاج ہوں۔

اسی طرح حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو

یہ جملہ لکھ دیا۔

مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں

بہرحال! اگر مدینہ میں آدمی رہے اور اس طرح رہے جس طرح حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ رہتے تھے، تب تو مزہ ہے، یہ نہ ہو کہ رہے تو مدینہ میں، دل لگا ہوا ہو پاکستان اور ہندوستان میں، اس سے بہتر یہ ہے کہ آدمی یہاں پاکستان میں رہے اور دل مدینہ کی طرف لگا رہے۔ امیر مینائی نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے ؎

مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

کسی نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا آپ نے کہا کہ مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں، ارے واپس ہی کیوں آؤں؟ وہیں کیوں نہ رہ پڑوں۔ انہوں نے کہا کہ مزہ اس میں ہے کہ مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ صورت بہتر ہے اس سے کہ آدمی وہاں رہے اور یہاں کے بارے میں سوچتا رہے۔

ہمّت کو استعمال کریں

ارشاد فرمایا کہ:

اختیاری امور میں کوتاہی کا علاج بجز ہمّت اور استعمالِ

اختیار کے کچھ نہیں، اسی پر مدار ہے تمام اصلاحات کا،
اور یہی ہے اصل علاج تمام کوتاہیوں کا۔

(انفاس عیسی ص ۱۳)

آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم کسی شیخ کے پاس جائیں گے تو وہ ایسی نظر ڈالے گا یا وہ ایسی پھونک مار دے گا جس سے دل چل جائے گا اور دنیا بدل جائے گی، اور ہماری زندگیوں میں انقلاب آ جائے گا۔ یاد رکھئے! یہ سب وقتی اثرات سے زیادہ کچھ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمت کو استعمال کئے بغیر اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اگر صرف نظر ڈال دینے سے اور پھونک مارنے سے کام چلا کرتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی، اور کسی تبلیغ و دعوت کی ضرورت نہ ہوتی، بس آپ ﷺ ایک نظر ڈال دیتے اور لوگ مسلمان ہو جاتے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ تصرف کرنا اور نظر ڈال دینا اور پھونک مار دینا یہ معمول کے طریقے نہیں ہیں۔

”تصرفات“ کی ایک مثال

البتہ بعض اوقات ان ”تصرفات“ سے فوری اور وقتی اثرات کے ذریعہ اصلاح حال میں کچھ مدد مل جاتی ہے، لیکن اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے انسان کی کایا نہیں پلٹ جاتی، اگر کسی نے نظر ڈال دی، یا کوئی تصرف کر

دیا تو اس کے نتیجے میں آدمی اصلاح کے راستے پر چلنا شروع تو کر دیتا ہے، لیکن آگے بڑھنے کے لئے اور مستقل چلتے رہنے کے لئے اپنی ہمّت ہی کو استعمال کرنا ہوگا۔ ان "تصرفات" کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً گاڑی کا "سیلف اسٹارٹر" خراب ہوگیا، یا گاڑی کی بیٹری کمزور ہوگئی، اب اس گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے، اب اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنا ہوگا، چنانچہ دھکا لگانے کے نتیجے میں اس کی بیٹری میں تھوڑی سی قوت پیدا ہوگئی اور گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ اب آگے وہ اپنی بیٹری اور انجن کی قوّت سے چلے گی، لیکن اگر بیٹری میں اور انجن میں جان ہی نہیں ہے تو پھر کتنے بھی دھکے لگاتے رہو، وہ گاڑی چل کر نہیں دے گی۔

اسی طرح کسی بزرگ کا تصرف کر دینا یا توجہ ڈالدینا، یہ درحقیقت دھکا لگانا ہے، اس کے نتیجے میں انسان کے اندر کچھ نشاط اور جوش عمل پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے کچھ عمل کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ لیکن آگے عمل کو خود ہی جاری رکھنا ہوگا، یہ نہیں ہو سکتا کہ محض تصرف اور توجہ کے نتیجے میں ساری زندگی عمل ہوتا رہے، بلکہ آگے اپنے اختیار سے ہی عمل کرنا ہوگا۔

کوتاہی اور سستی کا علاج

یاد رکھئے! کوتاہی کا علاج اور سستی کا علاج بجز استعمال ہمّت کے کچھ اور

نہیں۔ کسی کام کے کرنے سے سستی ہو رہی ہے، اس کا راستہ یہ ہے کہ عزم اور ہمّت کر کے اس سستی کا مقابلہ کرے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ سستی کے علاج کے لئے کوئی نسخہ گھول کر پلا دیا جائے تو ایسا کوئی نسخہ آج تک وجود میں نہیں آیا۔ لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ حضرت! نماز میں بڑی کوتاہی اور سستی ہو جاتی ہے، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتا دیجئے۔ ارے بھائی! اس کے لئے سب سے بڑا وظیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہمّت دی ہے، اس ہمّت کو استعمال کرو، جب اس ہمّت کو استعمال کرو گے تب تمہارا کام بنے گا، جھاڑ پھونک سے یہ کام نہیں بنا کرتا، ہمّت سے کام بنتا ہے۔

انسان کی ہمّت میں طاقت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اتنی طاقت رکھی ہے کہ کوئی حد وحساب نہیں، اللہ تعالیٰ اس ہمّت کے ذریعہ بڑے بڑے کام کرا دیتے ہیں جو انسان کے تصور میں نہیں آسکتے، اس ہمّت کے نتیجے میں انسان چاند تک پہنچ گیا، ورنہ پہلے چاند پر جانے کو ناممکن سمجھا جاتا تھا، لیکن جب ہمّت کی تو پہنچ گیا، لہٰذا جب ہمّت کر کے انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے تو اپنے نفس پر کیوں قابو نہیں پا سکتا اگر قابو کرنا چاہے۔

میرا ایک شعر ہے کہ:

کمندیں ڈال رکھی ہیں میری ہمّت نے تاروں پر

مگر ابتک دلِ ناداں کی نادانی نہیں جاتی

یعنی ہمّت نے تو تاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں، اور چاند پر اور مریخ پر اور زہرہ پر پہنچ گیا، مگر اس دل پر اب تک قابو نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا جب انسان ان چیزوں پر قابو پاسکتا ہے تو اس نفس اور دل پر قابو کیوں نہیں پاسکتا؟ بس انسان اس کا مراقبہ کرے اور اپنی ہمّت کو تازہ کرے، یہی راستہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ہمّت عطا فرمائے اور ہمارے اعمال و اخلاق کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۷
تصرف کی حقیقت
جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی
ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن
میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۷

صفحات : ۱۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ؕ

مجلس نمبر ۲۷

تصرّف کی حقیقت

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔ والصّلاۃ والسّلام علی رسوله الکریم۔ وعلی آله وأصحابه اجمعین ۔ أمّا بعد!

حضرت والا کا ارشاد ہے کہ:

اگر یہ خیال ہو کہ بعض بزرگوں کی توجہ سے بڑے بڑے بدکاروں کی خود بخود اصلاح ہو گئی ہے تو یہ ایک قسم کا تصرف ہے اور ایسا تصرف نہ اختیاری ہے اور نہ بزرگی کے لئے لازم ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴)

جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ انسان کو عمل کرنے کے لئے اپنی ہمّت کو اور اپنے ارادے اور اختیار کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ جو تصوّر ہے کہ جب ہم کسی شیخ کے پاس جائیں گے تو وہ ایسی نگاہ ڈال دے گا کہ اس کے نتیجے میں ہماری زندگی کی کایا پلٹ جائے گی۔ یہ بات اس عموم کے ساتھ درست نہیں۔

حافظ شیرازی کا واقعہ

البتہ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ بعض بزرگوں کے واقعات ایسے ملتے ہیں کہ بڑے بڑے بدکار لوگ ان کے پاس پہنچے، ان بزرگ نے ان پر توجہ ڈالی، اس کے نتیجے میں ان بدکاروں کی اصلاح ہوگئی۔ مثلاً حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ویسے ہی جنگل میں آوارہ پھرا کرتے تھے، بچپن ہی سے شعر بہت کہتے تھے، ان کے والد حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، ایک مرتبہ حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید کے گھر آئے تو انہوں نے اپنی ساری اولاد کو حضرت کے سامنے پیش کیا اور ان کے لئے دعا کرائی، حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سب کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور سب کو دعائیں دیں۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جنگل میں آوارہ پھرا کرتے تھے، حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تمہارا ایک لڑکا اور بھی تو ہے، وہ کہاں ہے؟ ان کے والد نے کہا کہ وہ تو کہیں جنگل میں آوارہ پھر رہا ہوگا،

آپ نے فرمایا کہ اس کو بھی بلاؤ، ان کے والد نے ایک آدمی بھیجا، یہ جنگل میں پھر رہے تھے، اس نے جا کر ان کو پکڑا اور ان سے کہا کہ تمہارے والد بلا رہے ہیں، شاید یہ بھی بتا دیا کہ ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، ان سے تمہارے لئے دعا کرانی ہے۔

یہ سن کر حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ قاصد کے ہمراہ چلے آئے، جب گھر میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہیں تو ان کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ لوگ جو اپنی ایک نظر سے مٹی کو کیمیا بنا دیتے ہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سرسری سی نظر ہمارے اوپر بھی ڈال دیں۔

شیخ نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب میں فرمایا:

نظر کردیم، نظر کردیم، نظر کردیم

بس! ایک نظر ڈالنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے اس صاحبزادے کو جو جنگلوں اور بازاروں میں آوارہ گھوم رہے تھے، کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور اب اونچے درجے کے صوفیاء کرام میں ان کا شمار ہوتا ہے، ان کی ساری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ نے ان کے دیوان کی شرح "عرفان حافظ" کے نام سے

لکھی ہے۔ ان کے دیوان کا نام "دیوان حافظ" ہے۔

"تصرّف" اختیاری نہیں

اب یہ جو کچھ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوا، بظاہر تو یہ ہوا کہ حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نگاہ ڈال دی اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ آج بھی لوگوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمیں بھی ایسا ہی کوئی نگاہ ڈالنے والا اور کوئی تصرف کرنے والا مل جائے تو اس سے ہمارا کام بن جائے۔

اس کے جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ:

> اگر یہ خیال ہو کہ بعض بزرگوں کی توجہ سے بڑے بڑے بدکاروں کی خود بخود اصلاح ہو گئی، تو یہ ایک قسم کا تصرف ہے (یعنی کسی بزرگ نے اگر ایسا کیا تو یہ محض تصرف خیالی ہے) اور ایسا تصرف نہ اختیاری ہے اور نہ بزرگی کے لئے لازم ہے۔

یعنی کسی بزرگ کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہیں تصرف کر دیں، یا اس تصرف کرنے کا کوئی خاص طریقہ ہو، یا کسب کے ذریعہ یہ فن اور ملکہ حاصل ہو جائے، پھر جب چاہیں جس پر چاہیں تصرف کر کے اس کے حالات بدل دیں۔ یاد رکھئے! ایسا نہیں ہے۔

بلکہ یہ تصرف کرنا یا اس کو حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے،

بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دَین ہوتی ہے، جس کو چاہتے ہیں عطا فرما دیتے ہیں، اور اس وقت عطا فرماتے ہیں جب اپنے کسی خاص بندے کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے اندر ارشاد ہے:

اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۤءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں تو کسی بزرگ کو ذریعہ بنا دیتے ہیں، اور اس کی نگاہ میں اور اس کے خیالات میں تاثیر پیدا فرما دیتے ہیں، ورنہ خود سے ان بزرگ کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنے اندر تصرف کا ملکہ پیدا کریں۔ لہٰذا اصل میں تو تصرف کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، البتہ بزرگ کو ذریعہ اور واسطہ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے یہ "تصرف" اختیاری نہیں۔

تصرف بزرگی کے لئے لازم نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ یہ "تصرف" بزرگی کے لئے لازم نہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھا جائے کہ جو بھی بزرگ ہوگا اس کو ضرور "تصرف" کرنا آتا ہوگا۔ کتنے اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں جن کو تصرف کرنا نہیں آتا تھا، اس کی وجہ سے ان کے کمال میں کوئی نقص نہیں آیا۔ اصل کمال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتوں کی اتباع ہو، سارے کمالات کا مرجع اور ماویٰ اور تمام کمالات کا منتہا یہ ہے کہ ہر گوشہ زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتوں کی اتباع ہو، تصرف حاصل ہوا یا نہیں؟ کوئی کشف ہوا یا

نہیں، کوئی الہام آیا کہ نہیں آیا، کوئی خواب نظر آیا کہ نہیں آیا، کوئی کرامت ظاہر ہوئی یا نہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر عطا ہو جائے تو اللہ کی نعمت ہے، اگر عطا نہ ہو تو کوئی پریشانی کی اور نقص کی بات نہیں۔ لہٰذا اگر کسی بزرگ میں یہ بات موجود نہ ہو تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ اس کی بزرگی میں نقص ہے۔

بلکہ ہمارے بزرگ تو ان خوارق سے دور ہٹتے ہیں اور ان کو پسند نہیں کرتے، ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ خوارق ان سے ظاہر ہی نہ ہوں تو بہتر ہے، اس لئے کہ ان میں خطرات بہت ہیں، کیونکہ آج اگر کسی کو ذرا کشف ہو جائے گا تو وہ اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سے کیا سمجھ بیٹھے گا اور اس کے دماغ میں کیسا خنّاس پیدا ہو جائے گا، اور پھر لوگوں پر اپنی بڑائی جتانے لگے گا اور اس کی وجہ سے کبر اور عجب پیدا ہو جائے گا، اس طرح وہ گناہ کبیرہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

حضرت حاجی صاحبؒ کا ایک واقعہ

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ کھانا کم تھا، اور کھانے والے زیادہ تھے، تو آپ نے اپنا رومال اس کھانے پر ڈال دیا جس کی برکت سے وہ کھانا پورا ہو گیا۔

حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حاجی صاحبؒ کے دوست اور ہمعصر تھے اور ایک ہی خانقاہ میں بیٹھتے تھے، ان کو جب رومال

ڈالنے کے بارے میں پتہ چلا تو حاجی صاحب سے کہا کہ واہ، اب آپ کا رومال سلامت چاہئے، اب دنیا میں کسی کو کسی چیز کی قلت نہیں ہوا کرے گی، گویا کہ انہوں نے اس عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ آپ نے یہ اچھا کام نہیں کیا، اس سے لوگوں کا عقیدہ خراب ہو جائے گا کہ بس رومال ڈالو اور چیزوں میں اضافہ کرالو۔ اس پر حضرت حاجی صاحبؒ نے ندامت کا اظہار کیا کہ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا ہمارے حضرات ان چیزوں سے بچتے تھے۔

کشف و کرامات سے گمراہی کی طرف

چنانچہ جہاں کہیں لوگوں میں کشف، کرامات، الہامات کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو اگرچہ شروع میں تو حدود سے تجاوز نہ ہو، لیکن جب آگے بڑھتے ہیں تو اس کے نتیجے میں گمراہی میں مبتلا ہو ہی جاتے ہیں۔

پیراں نمی پرند مریداں می پرانید

یعنی پیر اگر گمراہ نہیں ہوتے تو مرید آگے چل کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ چند سال پہلے ایک صاحب کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے تو وہاں پر شروع شروع میں ایسی کوئی خرابی کی بات نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب ان باتوں پر زیادہ زور دیا گیا تو اس کے نتیجے میں وہ گمراہی کے راستے پر پڑ گئے۔ اس لئے ہمارے حضرات ان کشف و کرامات کے چرچے اور ان کی

طرف توجہ رکھنے کو پسند نہیں فرماتے۔

اللہ تعالیٰ ظرف کے مطابق دیتے ہیں

جس سے بعض لوگوں کو یہ بھی خیال گزرا کہ شاید ان حضرات میں یہ چیزیں تھی ہی نہیں، اور بالفرض اگر یہی مان لیا جائے کہ آج کل کے بزرگوں میں یہ چیزیں ہیں ہی نہیں تو اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں اختیاری نہیں ہیں۔ اب رہا یہ اعتراض کہ پہلے زمانے میں جو اولیاء اللہ ہوتے تھے، وہ تو بڑے کشف و کرامات والے بزرگ ہوتے تھے، ان کے کشف کے ایک سے ایک واقعات سننے میں آتے تھے، اب کوئی اللہ کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا، اب تو نہ کشف ہے نہ کرامت ہے، ایسے اللہ والے کہاں سے لائیں، ایسا بزرگ تو اب ملتا نہیں ہے۔ اس کا جواب وہ ہے جو غالب نے ایک مصرعہ میں کہا ہے کہ:

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ممکن ہے کہ آج کل ایسی کیفیات کے عمومی اظہار سے بزرگوں کو خود چاہے نقصان نہ ہو مگر عوام الناس کو اس سے نقصان کا خطرہ زیادہ ہے، اس لئے ان کیفیتوں میں کمی کر دی گئی ہو۔ پھر یہ چیزیں فضیلت، شرافت اور بزرگی کا معیار بھی نہیں ہیں اور نہ بزرگی کے لئے یہ چیزیں لازم ہیں۔ لہٰذا جب کسی بزرگ کے پاس جاؤ تو یہ سوچ کر مت جاؤ کہ ان کو یہ چیزیں حاصل ہوں گی۔

تصرف کے اثر کو بقا نہیں

آگے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بہت سے بزرگوں میں تصرف مطلق نہیں ہوتا، نیز تصرف کے اثر کو بقا نہیں ہوتی۔

جیسے پہلے عرض کیا تھا کہ "تصرف" کے اثر سے وقتی طور پر ذرا سی گرمی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس اثر کو بقا نہیں ہوتا، آگے کام اپنی ہمّت اور اختیار سے چلے گا اور اپنے عمل سے چلے گا، "تصرف" کا عمل صرف گاڑی کو دھکا لگانے کی طرح ہے، "تصرف" نے تو ایک دھکا لگا دیا، لیکن آگے گاڑی اپنے انجن کی طاقت سے چلے گی۔

تصرف کی مثال

پھر آگے حضرت والا نے "تصرف" کی ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا:

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص تنور کے پاس بیٹھ گیا تو جب تک وہاں بیٹھا ہوا ہے تمام بدن گرم ہے، مگر جیسے ہی وہاں سے ہٹا پھر ٹھنڈا کا ٹھنڈا، بخلاف اس کے جو (اپنی) ہمّت اور (اپنے) اعمال کے ذریعے اثر ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے۔

اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کشتہ طلا کھا کر

اپنے اندر حرارت غریزی پیدا کرلی تو اگر وہ شملہ پہاڑ پر بھی چلا جائے گا تب بھی وہ حرارت بدستور باقی رہے گی۔

(انفاس عیسی ص ۱۵)

"تصرف" اور اپنی "ہمت" دونوں کو دو مثالوں کے ذریعہ سمجھا دیا کہ "تصرف" کے نتیجے میں جو حرارت پیدا ہوتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے، وہ فنا ہو جانے والی ہے، جیسے تنور کے پاس بیٹھنے والے کے جسم میں حرارت تو پیدا ہوئی لیکن وہ حرارت عارضی ہے، جلد ختم ہو جائے گی۔ اسی تصرف کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے ذرا سا نشاط پیدا ہوگا پھر ختم ہو جائے گا، آگے عمل پھر اپنی ہمت سے ہی کرنا ہوگا۔ اور مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ اور اپنی ہمت کے ذریعہ جو عمل کیا جاتا ہے اس کو بقا ہوتی ہے، وہ پائیدار ہوتا ہے، وہ جلدی فنا نہیں ہوتا۔

ہمّت اور اعمال کی مثال

اس کو بھی دوسری مثال کے ذریعہ سمجھایا کہ جیسے کسی شخص نے سونے کا کشتہ کھا کھا کر اپنے اندر حرارت غریزی پیدا کرلی ہو تو اگر وہ شملہ پہاڑ پر بھی چلا جائے گا تب بھی اس کی حرارت بدستور باقی رہے گی۔ اس لئے اس فکر میں نہیں پڑنا چاہئے کہ کوئی تصرف کر دے، بلکہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ سنّت کا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس پر

عمل کرنا شروع کردو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:

برصراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

سنّت کے راستے پر چلنے سے گمراہی کا کوئی خطرہ نہیں، بس اس کو اختیار کرلو۔

اتباع سنّت سے وصول تیزی سے ہوتا ہے

حکیم الامّت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مختلف بزرگوں نے جو مختلف راستے اختیار کئے ہیں، اور مختلف قسم کے مجاہدات، مختلف قسم کی ریاضتیں اپنے اپنے تجربات سے اختیار کی ہیں اور مختلف قسم کے تصرفات اختیار کئے ہیں، ان راستوں کے ذریعہ "وصول الی اللہ" دیر سے ہوتا ہے۔ ایک راستہ اتباع سنّت کا ہے، اتباع سنّت کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب جیسے مثلاً "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" سامنے رکھو اور اس میں دیکھو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیا سنّتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک ایک سنّت لے کر اس پر عمل کرتے رہو، اور جس سنّت پر عمل کرنے کی عادت نہیں ہے اس کی عادت ڈالتے جاؤ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اتباع سنّت" کے راستے سے وصول تیزی سے ہوتا ہے۔

اتباعِ سنّت میں "محبوبیت" کی شان

پھر اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ "اتباعِ سنّت" کی خاصیت "محبوبیت" ہے۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبّت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبّت کریں گے، اور تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ پہلے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو، پھر آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

لہٰذا اتباعِ سنّت کے اندر محبوبیت کی شان پائی جاتی ہے، اور وہ مخلوق کی محبوبیت نہیں ہے، بلکہ اللہ جلّ شانہ کی محبوبیت ہے۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت کوئی مسلمان بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت اتباعِ سنّت کی نیت سے اپنا بایاں پاؤں داخل کر رہا ہے اور یہ دعا پڑھ رہا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

اس وقت وہ مسلمان اللہ تعالیٰ کا محبوب بن رہا ہے۔ لہٰذا جو شخص اتباعِ سنّت کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن رہا ہے، گویا کہ اللہ "محب" اور وہ شخص "محبوب" اور محبّت کی خاصیت ہے جذب کرنا، یعنی محبّ محبوب کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور محبوب محبّ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس لئے جب

انسان اتباعِ سنّت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اس طرح جذب کے ذریعہ اس کو وصول الی اللہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کھینچ لیں گے تو اس کے ذریعہ وصول جلدی ہو گا، اس کے مقابلے میں اگر انسان خود چل کر جائے تو وصول دیر سے ہو گا۔ اس لئے فرمایا کہ اتباع سنّت میں وصول تیزی سے ہوتا ہے، اور دوسرے ذرائع جو صوفیاء کرام نے اخیار کئے ہیں، وہ سب طریقے بھی جائز اور مباح ہیں، لیکن ان کے ذریعہ وصول اتنی تیزی سے نہیں ہوتا۔

ایک ایک سنّت پر عمل کرتے جاؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے میاں! تصوف کی ان اصطلاحات کے پھیر میں مت پڑو، سیدھا سیدھا عمل کرو، وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنّتیں منقول ہیں، ان میں سے ایک ایک سنّت کو سیکھتے جاؤ اور ان پر عمل کرتے جاؤ، انشاء اللہ منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ اسی لئے ہمارے بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا خلاصہ "اتباع سنّت" ہے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے میں نے تمہارے لئے ایک ڈائری بنادی ہے اور اس میں سب سنّتیں لکھدی ہیں کہ اس طرح سونا ہے، اس طرح جاگنا ہے، اس طرح اٹھنا ہے، اس طرح بیٹھنا ہے، اس طرح کھانا ہے، اس طرح پینا ہے،

اس طرح باتیں کرنی ہیں۔

تمام سنّتوں پر عمل کرو

البتہ میں سب حضرات سے ایک بات اور عرض کرتا ہوں کہ اتباع سنت کی کچھ باتیں تو مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ جب مسجد میں داخل ہوں تو دایاں پاؤں پہلے داخل کرو، اور جب باہر نکلو تو بایاں پاؤں پہلے داخل کرو۔ کھانا داہنے ہاتھ سے کھاؤ، کھانے سے پہلے ہاتھ دھولو، بسم اللہ پڑھ کر شروع کرو، بیٹھ کر پانی پیو، تین سانس میں پانی پیو، پانی پینے کے بعد الحمد للہ کہو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتیں ہیں، اور قابل تقلید ہیں، سب میں بڑی فضیلت ہے۔ لیکن سنّتیں صرف ان کے اندر محدود نہیں ہیں، بلکہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، ہمارے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں، حلم اور بردباری اختیار کرنا، غصہ نہ کرنا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا یہ سب بھی سنّتیں ہیں۔ لہٰذا اخلاق سے متعلق، معاملات سے متعلق، معاشرت سے متعلق بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتیں ہیں۔ مثلاً یہ بھی سنت ہے کہ جب تولو تو جھکتا ہوا تولو، اور دوسرے کو بڑھتا ہوا دو، اور اگر دوسرے سے کوئی حق لینا ہے تو اس کے خاطر تھوڑا حق چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو، اور جب دوسرے کو دینا ہے تو زیادہ کر کے دو، دینے میں اپنے دل کو کشادہ رکھو۔ یہ سب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتیں ہیں۔ لہٰذا جس طرح ان مشہور سنّتوں پر عمل کرنے کا

جتنا اہتمام کرتے ہیں، اتنا ہی ان سنّتوں پر بھی عمل کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی ان سنّتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۲۸

جبلی صفاتِ رذیلہ کی اصلاح

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۸

صفحات : ۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۸

جبلّی صفات رذیلہ کی اصلاح

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلمین ۔ والعاقبۃ للمتقین ۔ والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ الکریم ۔ وعلٰی آلہ وأصحابہٖ اجمعین ۔ أمّا بعد!

مادہ جبلّی فعل اختیاری

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر یہ شبہ ہو کہ جبلّت تو کسی کی بدل نہیں سکتی، پھر جبلّی صفات رذیلہ کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے؟ تو خوب سمجھ لو کہ مادہ جبلّی ہوتا ہے، مگر فعل اختیار میں ہے، پس مادہ بیشک زائل نہیں ہوتا، مگر اس کے مقتضٰی پر عمل کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے، اور اسی کا انسان مکلّف ہے، اور بار بار اس مقتضٰی کی مخالفت کرنے سے وہ مادہ

بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۵)

اس ملفوظ سے حضرت والا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جتنی صفات رذیلہ ہوتی ہیں، بسا اوقات انسان کے اندر ان صفات کا مزاج ڈھلا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صفات جبلّی ہیں۔

غصہ جبلّی صفت ہے

مثلاً کسی شخص کے بارے میں مشاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے اندر غصہ زیادہ ہے، اب غصہ کا زیادہ ہونا جبلّی صفت ہے، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر غصہ بہت کم ہوتا ہے، فطری اور پیدائشی طور پر وہ نرم مزاج ہوتے ہیں، ان کو غصہ بہت کم آتا ہے۔ اور بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر پیدائشی اور طبعی طور پر غصہ زیادہ ہوتا ہے، جبلّی طور پر وہ غصہ ور آدمی ہے۔ جبلّی صفت اس کو کہتے ہیں جو کبھی زائل نہ ہو، وہ صفت انسان کے اپنے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ صفت کیسے زائل ہو؟ اور اس کو انسان کیسے ختم کرے؟

حضرت والا اس شبہ کا جواب دے رہے ہیں کہ یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ ان صفات کو بذات خود زائل کرنے کا انسان مکلّف نہیں، بلکہ انسان اس بات کا مکلّف ہے کہ اس جبلّی صفات کے جو ناجائز تقاضے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان تقاضوں پر اپنے اعضاء اور جوارح سے عمل نہ کرے

اور یہ انسان کے اختیار میں ہے۔

مثلاً اگر کسی شخص میں غصہ زیادہ ہے تو یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ وہ غصہ بالکلیہ ختم ہو جائے، وہ غصہ تو ایک جبلّی صفت ہے جو ختم نہیں ہو سکتی، وہ تو باقی رہے گی، لیکن اس انسان کے اختیار میں یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو اس غصہ کا کوئی غیر شرعی مظاہرہ اپنے ہاتھ اور زبان سے نہ کرے۔ بس انسان اس کا مکلّف ہے اور یہ اختیار میں ہے۔

غصہ کے مقتضیٰ پر عمل

اسی وجہ سے غصہ کا آنا بھی کوئی گناہ نہیں اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا بھی ہمیشہ گناہ نہیں ہوتا، لیکن غصہ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اس وقت جب کہ وہ غصہ بے محل ہو، یہ گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص نے آپ کے اوپر حملہ کر دیا، اب آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اور اپنا مال بچانے کے لئے اس کا دفاع کرنے کی ضرورت ہے، اور اس حملہ کرنے کے نتیجے میں جو غصہ آیا ہے، اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر اس موقع پر آدمی تواضع سے کام لینے لگے تو یہ درست نہیں، بلکہ اس موقع پر غصہ کے مقتضیٰ پر حد کے اندر رہتے ہوئے عمل کرنا جائز ہے۔

لیکن جہاں غصہ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا جائز نہیں، یا جائز تو ہے مگر مناسب نہیں، مثلاً ابتداءً جو سالک شیخ سے تعلق قائم کرتا ہے تو شیخ اس کو یہ بتاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرنا، نہ تو جائز غصہ کرنا اور نہ ہی ناجائز

غصہ کرنا، یعنی جہاں غصہ کرنے کا جائز محل ہو، وہاں بھی غصہ نہ کرنا، کیونکہ ابھی اگر جائز جگہ پر بھی تم غصہ کروگے تو اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں ناجائز غصے میں نہ پڑ جاؤ، کیونکہ ابھی غصہ پر قابو پیدا نہیں ہوا ہے، اس لئے شیخ کہتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو۔ اب اس سالک کے لئے جائز محل میں غصہ کرنا جائز تو ہے لیکن غصہ پر ضبط کی تربیت کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ اسی لیے شیخ نے غصہ کرنے سے منع کیا ہے۔

اس وقت غصہ پر عمل مت کرو

بہر حال! غصہ کا آنا کوئی مذموم نہیں، لیکن غصہ آنے کے بعد اس غصے کے تقاضے پر عمل کرنا بسا اوقات مذموم ہے، مثلاً غصہ آیا اور دل چاہا کہ فلاں کو ایک تھپڑ کھینچ کر ماروں اور تھپڑ ماردیا حالانکہ مارنے کا حق نہیں تھا یا مارنے کا حق تو تھا لیکن جتنا مارنے کا حق تھا، اس سے زیادہ ماردیا۔ یہ ہے غصہ کے مقتضیٰ پر ناجائز عمل اور یہ گناہ ہے۔ لہٰذا جب غصہ آیا تھا اور اس کے نتیجے میں دل میں جو ہیجان پیدا ہوا تھا، اس ہیجان کے پیدا ہونے پر کوئی مؤاخذہ نہیں، وہ ہیجان کوئی گناہ نہیں، لیکن اس ہیجان پر جو مظاہرہ کیا کہ زور سے تھپڑ ماردیا، اب یہ گناہ ہوگیا۔

غصہ میں بچے کو مارنا

مثلاً ایک استاد کو یہ حق تھا کہ وہ اپنے شاگرد کو تادیباً مار لے، لیکن اس کو صرف یہ حق تھا کہ وہ تادیباً اتنا مارے جس میں ایلام اور تکلیف نہ ہو، اس

سے زیادہ مارنا جائز نہیں تھا، لیکن جب استاذ کو غصہ آیا تو اس کے نتیجے میں اس نے شاگرد کو اتنا مار دیا کہ اس کے بدن پر نیل پڑ گئے، یا اس شاگرد کو حد سے زیادہ تکلیف پہونچ گئی، تو یہ حرام کا ارتکاب ہوا، اور یہ ایسا حرام ہے کہ اس کی معافی بھی آسان نہیں، کیونکہ بسا اوقات وہ شاگرد نابالغ بھی ہوتا ہے، جو اگر معاف کر بھی دے تو بھی معاف نہیں ہوتا، اس لئے یہ بڑا خطرناک گناہ سرزد ہوا جس کا محرک یہی غصہ تھا۔

اب دیکھئے کہ اس ہیجان کا پیدا ہونا تو گناہ نہیں تھا، لیکن ہیجان آنے پر بچے کو زور سے ڈنڈی مار دی، اب یہ گناہ ہو گیا، یہ حرام فعل ہو گیا۔ لہٰذا اس ہیجان کے مقتضیٰ پر عمل کرنا حرام ہے، اور اس مقتضیٰ پر عمل کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے۔ دیکھئے! غصہ آنا نہ آنا اختیار میں نہیں، کیونکہ وہ جبلّی ہے، لیکن مارنا نہ مارنا اختیار میں ہے، بس یہی امتحان ہے کہ جب غصہ آیا تو اس غصّے کے مقتضیٰ پر عمل کیا یا نہیں؟ اگر عمل کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نفس کے آگے آپ نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اگر نفس کے آگے ڈٹ گیا اور یہ تہیّہ کر لیا کہ چاہے کتنا بھی غصہ آئے، لیکن نہیں ماروں گا، تو بس اس نے غصّے پر قابو پالیا۔

غصّہ کے وقت یہ سوچا کرو

اسی طرح طبیعت میں ہیجان اور اشتعال پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص کو خوب گالیاں دوں، اس کے ماں باپ کو اور اس کے خاندان کو

گالیاں دوں اور سب کو برا بھلا کہوں، لیکن یہ سوچا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے سے روک لیا، یہ روکنا اس کے اختیار میں تھا، تو اس روکنے پر اس کو اجر ملے گا، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ۔

بہر حال جتنے رذائل جبلّیہ ہیں، ان کا زائل کرنا چونکہ انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے ان کو زائل کرنے کا انسان مکلّف بھی نہیں، بس انسان اس بات کا مکلّف ہے کہ ان جبلّی صفات کو اپنے اختیار سے بے محل استعمال نہ کرے۔

"حسد" ایک فطری جذبہ ہے

اسی طرح "حسد" ایک فطری اور جبلّی جذبہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر ہمارے دل میں اس بات کا داعیہ اور خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس شخص سے یہ نعمت زائل ہو جائے، اس کو یہ نعمت کیوں مل گئی؟ اس کا بنگلہ اتنا اچھا کیوں بن گیا؟ اس کو اتنے پیسے کیوں حاصل ہوگئے؟ اس کو اتنی شہرت کیوں مل گئی؟ اس کو ایسا منصب کیوں مل گیا؟ یہ منصب اس سے چھن جائے، ان خواہشات کا نام "حسد" ہے۔ اب غور سے سنو!

غیر اختیاری طور پر ان خواہشات کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں،

مثلاً غیر اختیاری طور پر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، اگر یہ مجھ سے آگے نہ بڑھتا تو اچھا تھا (خوب اچھی طرح سمجھ لو، اس لئے کہ یہ نازک بات ہے) یہ خواہش جو غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ بذات خود کوئی گناہ نہیں، لیکن جب یہ خواہش پیدا ہوئی تو اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی عمل کرلیا۔ مثلاً یہ دعا کرلی کہ یا اللہ! اس کی یہ دولت چھن جائے۔ بس یہ گناہ اور حرام کام ہو گیا، اس لئے کہ اس خواہش کے داعیے اور مقتضٰی پر عمل کرلیا۔ یا مثلاً اس کی کسی سے شکایت کر دی کہ فلاں آدمی کو تم نے ملازم رکھ لیا، وہ تو صحیح آدمی نہیں ہے، تم اس کو ملازمت سے نکال دو، بس یہ عمل حرام ہو گیا۔ یا کسی سے اس کی برائی کر دی کہ وہ تو ایسا ہے، یا کسی بہانے سے اسے رسوا کرنے کی کوشش کر ڈالی، بس یہ حرام ہے۔

لہٰذا محض دل میں خواہش کا پیدا ہونا، یا کسی کو دولت حاصل ہونے پر دل میں اس کی طرف سے غیر اختیاری طور پر کراھیت کا پیدا ہونا بذات خود حرام نہیں جب تک انسان اس کے مقتضٰی پر عمل نہ کرے، لہٰذا خواہش جو دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ "حسد" ہے لیکن یہ حسد حرام کی حد تک نہیں پہنچا۔

خواہش کا زیادہ دیر دل میں رہنا

البتہ اس خواہش کا زیادہ عرصے تک دل میں رہنا بڑا خطرناک ہے، خطرناک اس لئے ہے کہ جب زیادہ عرصے تک دل میں یہ خواہش رہے گی تو

کسی نہ کسی وقت انسان کو ایسے فعل پر آمادہ کردے گی جو حرام ہو گا، اور بہت ممکن ہے کہ اس وقت آدمی کو اس کا احساس بھی نہ ہونے پائے کہ میرا یہ فعل میرے جذبہ حسد کی کار فرمائی ہے، اس لئے اس خواہش کو ختم کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ابھی تو اس کا زہر نکلا ہوا ہے، لیکن کسی نہ کسی وقت یہ ڈس لے گا، لہٰذا اس خواہش کے مخالف عمل کرے۔

مثلاً دل میں تو یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ دولت اس سے چھن جائے، لیکن ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرو کہ یا اللہ! آپ نے اس کو جو دولت عطا فرمائی ہے، اس میں اور زیادہ برکت عطا فرما، اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ جس وقت حسد کرنے والا یہ دعا کرے گا اس وقت اس کے دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانا ہی مطلوب ہے اور اسی سے انسان کا درجہ بلند ہوتا ہے، اسی سے وہ ترقی کرتا ہے اور اس کے روحانی مدارج اسی سے بڑھتے ہیں۔

خواہشات کے خلاف عمل کرو

اور دل میں جو خواہش پیدا ہو رہی تھی، جب اس کے مخالف عمل کرے گا۔ اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے گا، تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ رفتہ رفتہ وہ خواہش بھی کمزور اور ضعیف ہو جائے گی، اور جب کمزور ہو جائے گی تو پھر یہ خطرہ نہیں رہے گا کہ کہیں یہ خواہش اس آدمی کو چت نہ کردے۔ بس تمام رذائل کی اصلاح کا یہی سارا فلسفہ ہے، اسی لئے یہ کہا جاتا

ہے کہ ”رذائل“ کا ازالہ مقصود نہیں کہ ان رذائل کا مادہ ہی بالکل ختم ہو جائے، یہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا، بلکہ اِمالہ مقصود ہے کہ صحیح محل پر ان کا استعمال ہو، غلط جگہ پر استعمال نہ و (البتہ اسی امالہ کو بعض اوقات مجازاً ازالہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ جب حسد کے مقتضٰی پر عمل نہیں کیا گیا تو گویا حسد ہے ہی نہیں، زائل ہو گیا)۔

صفات رذیلہ ناگزیر ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ نے ”حجۃ اللہ البالغۃ“ میں لکھا ہے کہ انسان کے اندر جتنی صفات رذیلہ ہیں، یہ سب بقاء نوع انسانی کے لئے ناگزیر ہیں، یہ اگر نہ ہوں تو انسان کی نسل ہی باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر انسان کی طبیعت میں غصہ بالکل نہ ہو تو وہ مرے گا، اس لئے کہ جب کوئی درندہ اس پر حملہ کرے گا تو اس کو غصہ ہی نہیں آئے گا، شیر، سانپ، بچھو اس پر حملہ کریں گے اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے گا، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ مرے گا۔ یا مثلاً دشمن نے حملہ کر دیا، لیکن اس کو غصہ ہی نہیں آ رہا ہے، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ انسان نہیں ہے بلکہ پتھر ہے، نتیجہ یہ ہو گا کہ دشمن اس کو ختم کر دے گا، اس لئے اپنے دفاع کے لئے غصہ ضروری چیز ہے۔

شہوت ناگزیر ہے

اسی طرح فرمایا کہ ”شہوت“ بھی ناگزیر ہے، اس کے بغیر بقاء نوع

انسانی نہیں، اگر محل پر شہوت نہ ہو، شوہر کو بیوی کے ساتھ شہوت نہ ہو تو کیا نسل چلے گی؟ نہیں چلے گی، اس لئے بقاء نوع انسانی کے لئے ان سارے رذائل کا ہونا ضروری ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کا غلط جگہ پر استعمال ہو، مثلاً غصہ کا غلط جگہ پر استعمال ہو یا شہوت کا غلط جگہ پر استعمال ہو، تو اس وقت یہ رذائل برے ہیں۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ ان رذائل کو زائل نہیں کرنا بلکہ ان کو "مائل" کرنا ہے اور ان کو قابو میں کرنا ہے، تاکہ صحیح جگہ پر ان کا استعمال ہو جائے۔

اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ فلاں شخص کے اندر غصہ زیادہ ہے، وہ کیسے قابو پائے گا؟ وہ ضرور قابو پائے گا، اس لئے کہ غصہ پر قابو پانا اختیار میں ہے، غصہ کا آنا اختیار میں نہیں، لہٰذا جب غصہ آئے تو اس کو قابو میں کرنے کے لئے وہ طریقے اختیار کرے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر غصہ کے وقت تم کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ، کیونکہ غصہ "ناری" ہے اور "نار" (آگ) کا خاصہ یہ ہے کہ وہ طالب بلندی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف جاتی ہے، اسی لئے جب انسان کو غصہ آتا ہے تو اگر وہ لیٹا ہوا ہے تو بیٹھ جائے گا، اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو کھڑا ہو جائے گا، تم اس کے برخلاف کام کرو کہ اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ، تاکہ وہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ دوسرا طریقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

حدیث میں بیان فرمایا، وہ یہ کہ ٹھنڈا پانی پی لو۔ یہ بھی غصہ کا علاج ہے۔

غصہ کم کرنے کا علاج

غصہ کو ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس وقت یہ تصور کرو کہ مجھ کو اس شخص پر اتنی زیادہ قدرت نہیں ہے جتنی اللہ تعالیٰ کو مجھ پر قدرت حاصل ہے۔ یہ وہ مراقبہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا، وہ ایک مرتبہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ:

للّٰہ اقدر علیك منك علیه

یعنی اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں جتنی قدرت تم اس پر رکھتے ہو۔ تم اس پر اتنا غصہ کر رہے ہو، اگر اللہ میاں نے تم پر اتنا غصہ کر لیا تو تمہارا کیا حشر بنے گا؟ لہٰذا جب غصہ آئے، اگر اس وقت یہ طریقے اختیار کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غصہ جب آیا تھا تو اس وقت وہ غیر اختیاری تھا، لیکن جب اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہوا تو تم اس کے شر سے بچ گئے، اور غصہ جو ایک رذیلہ تھا وہ مائل ہو گیا اور اپنے صحیح محل پر برقرار رہا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❁❁❁

❁

مجلس نمبر ۲۹

شیخ کی ضرورت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۹

صفحات : ۱۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

مجلس نمبر ۲۹

شیخ کی ضرورت

اور شیخ کی دعا اور توجہ کی حقیقت

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔
والصّلاة والسّلام علی رسوله الكریم ۔
وعلی آله وأصحابه اجمعین ۔
أمّا بعدا!

حضرت والا نے فرمایا کہ:
شیخ کی دعا اور برکت کو بھی بڑا دخل ہے اصلاح میں،

لیکن اس کا درجہ محض اعانت کا ہے نہ کہ کفایت کا، جیسے
عرق سونف کا مرتبہ مسہل میں کہ محض عرق سونف بلا
مسہل کے کار آمد نہیں۔ یا طبیب اور مریض کی مثال
لے لو، اگر مریض دوا نہ پیے تو طبیب کی محض شفقت
اور توجہ سے مریض ہرگز اچھا نہیں ہوگا۔ یا استاذ اور
شاگرد کی مثال لے لو کہ محض استاذ کی توجہ سے سبق
یاد نہیں ہو سکتا بلکہ شاگرد کے یاد کرنے ہی سے یاد
ہوگا۔ شیخ کا اصل کام راستہ بتانا ہے، باقی راستہ کا قطع
کرنا سالک ہی کا کام ہے، جیسے اندھے کو سوانکھا راہ بتاتا
ہے، گود میں اٹھا کر اس کو نہیں لے جاتا، راستہ تو خود
اس کے چلنے ہی سے قطع ہوگا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵)

لوگوں کی ایک غلط فہمی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھیں گے، کسی پیر کے دامن سے وابستہ ہو جائیں گے، کسی سے بیعت کرلیں گے تو بس کام ہو جائے گا، اب اس کے بعد کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ خود بخود ہماری اصلاح بھی ہو جائے گی اور خود بخود اللہ تعالیٰ کے یہاں مقرّب بن جائیں گے اور سیدھے جنّت میں بھی پہنچ جائیں گے۔

شیخ کی توجہ اور دعا کا درجہ

حضرت والا اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز میں اعتدال رکھنا اور ہر چیز کو اپنی حد میں رکھنا ضروری ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ کی توجہ اور دعا میں مرید کے لئے بڑی برکت ہے، نہ تو اس کو بے فائدہ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس سے بے التفاتی ہونی چاہئے اور نہ ہی اس کی ناقدری کرنی چاہئے، اس لئے کہ شیخ کی دعائیں ملنا اور شیخ کی توجہات کا نصیب ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔

لیکن حضرت والا نے دو لفظوں میں اس کی حقیقت بیان فرمادی کہ:
"لیکن اس کا درجہ محض اعانت کا ہے نہ کہ کفایت کا۔" یعنی کام تو خود ہی کرنا ہوگا، لیکن شیخ کی دعا، اس کی توجہ، اس کی ہدایات اس کام کے لئے مدد و معاون ہو جاتی ہیں، اور اس سے ذرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے، اور ہمت میں ذرا تقویت آجاتی ہے اور مدد مل جاتی ہے، لیکن کام خود ہی کو کرنا ہوگا، راستہ خود ہی طے کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر کی صرف توجہ اور شفقت علاج کے لئے کافی نہیں

پھر اس کی مثال دی کہ جیسے ایک ڈاکٹر ہے، آپ اس کے پاس علاج کرانے کے لئے گئے، اب وہ ڈاکٹر آپ کے ساتھ کتنی ہی شفقت کرنے والا اور محبت کرنے والا ہو، وہ آپ پر کتنی بھی توجہ دے، لیکن محض اس ڈاکٹر

کی توجہ کرنے سے اور محبّت اور شفقت کرنے سے آپ کی بیماری دور نہیں ہوگی، جب تک اس کی بتائی ہوئی دوا استعمال نہیں کرو گے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرا ڈاکٹر بڑا ماہر ہے اور نبض شناس ہے اور بڑا شفیق ہے، اس لئے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ اس نے جاکر ڈاکٹر کو اپنا حال بتادیا، اور واپس گھر آکر بیٹھ گیا، اور اس کی بتائی ہوئی دوا پی نہیں، ایسا شخص کبھی ساری زندگی بھی صحت یاب نہیں ہو سکے گا، صحت یاب اس وقت ہو گا جب اس ڈاکٹر کے شفقت سے لکھے ہوئے نسخے کو استعمال کریگا اور اس کی بتائی ہوئی دوائیں اس کو خود بازار سے لانی ہوں گی، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ازراہ شفقت وہ دوائیں اپنے پاس سے دیدے اور اس کو خریدنی نہ پڑے، لیکن اس دوا کو استعمال تو اس کو ہی کرنا ہو گا، جب تک دوا کو استعمال نہیں کریگا، محض شفقت سے فائدہ نہیں ہوگا۔

راستہ خود طے کرنا پڑے گا

اسی طرح شیخ روحانی معالج ہوتا ہے، وہ "روح" کی بیماریوں کا علاج کرتا ہے، وہ امراض باطنہ کو پکڑتا ہے، پھر ان کا علاج تجویز کرتا ہے۔ اب اگر شیخ چاہے کتنا ہی شفیق اور مہربان ہو، کتنا ہی تم سے محبّت کرنے والا ہو، لیکن محض اس شفقت اور محبّت سے کام نہیں چلے گا جب تک تم خود راستے پر نہیں چلو گے اور قدم نہیں بڑھاؤ گے اور جب تک اس کے بتائے ہوئے علاج کے مطابق کام نہیں کرو گے۔ لہٰذا چلنا انسان کو خود ہی ہوتا ہے، خود

ہی عمل کرنا پڑتا ہے، اور آخرت کی جزا اور سزا بھی انسان کے اپنے عمل ہی پر ہوگی۔ البتہ شیخ راستہ دکھا دیتا ہے، راستہ متعیّن کر دیتا ہے اور علاج کا طریقہ سکھا دیتا ہے، البتہ اس راستے پر چلنا خود ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا شیخ کی توجہ اور دعا کو بالکل بیکار بھی مت سمجھو کہ سب کچھ میں کر رہا ہوں، شیخ تو کچھ بھی نہیں کر رہا ہے، ایسا بھی نہیں ہے، اس لئے کہ شیخ کی دعا اور توجہات کی برکت سے اللہ تعالیٰ سالک کی ہمت میں قوّت عطا فرما دیتے ہیں اور اعمال صالحہ میں نشاط اور ذوق و شوق پیدا کر دیتے ہیں۔

نیک عمل کو شیخ کی توجہ کا اثر سمجھو

اللہ تعالیٰ نے شیخ کا واسطہ اس لئے بھی رکھا ہے کہ اس کے تعلق کی نسبت سے بعض مکائد نفس کا علاج ہو جاتا ہے، مثلاً اپنا کوئی عمل اچھا معلوم ہوا کہ میں نے آج فلاں اچھا عمل کیا، فلاں عبادت انجام دیدی، تو شیطان اس کے دل میں یہ بڑائی کا خیال ڈالتا ہے کہ آج تو نے کمال کر دیا اور تو نے بڑے بڑے اولیاء اللہ والی صورت اپنے اندر پیدا کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص کبر اور عجب کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنے عمل کو اکارت کر دیتا ہے۔ اب ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ شیخ کے تعلق کو نفس کے اس کید سے بچنے کا ذریعہ بنا دیتے ہیں، وہ اس طرح کہ آدمی اس نیک عمل کو اپنے شیخ کی طرف منسوب کرے کہ الحمدللہ! مجھے نیک عمل کی جو توفیق ہوئی، وہ میرے شیخ کی برکت سے ہوئی، میرے شیخ کی توجہ اور دعا سے ہوئی، یعنی شیخ کی توجہ

اور دعا کی برکت سے میری ہمّت میں قوت پیدا ہوئی، اور اس قوت کے نتیجے میں اس عمل کی توفیق ہوئی۔ لہٰذا جب شیخ سے تعلق ہوگا تو اس نیک عمل کو شیخ کی طرف منسوب کردو گے، اس کے نتیجہ میں وہ نفس کا کید وہیں ختم ہو جائے گا۔

یہ سب حاجی صاحب کا فیض ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کئی مرتبہ دیکھا کہ کبھی عام وعظ کی مجلس میں اور کبھی خاص ملفوظات کی مجلس میں بیان فرما رہے ہوتے، اور بیان کے دوران جب کوئی بہت باریک اور دقیق بات یا اعلیٰ درجے کا کوئی نکتہ بیان فرماتے کہ جس سے سننے والے بھی جھوم اٹھتے تو اس کے بعد فوراً فرماتے کہ یہ سب میرے حاجی صاحب کا فیض ہے، یہ سب میرے حاجی صاحب کا فیض ہے، اور والہانہ انداز میں اس کو بار بار دھراتے اور اس کے ذریعہ اپنا علاج فرماتے، تاکہ نکتہ بیان کرنے کے بعد دماغ میں یہ خیال نہ آ جائے کہ میں نے آج بڑی اچھی اور عمدہ بات کہدی، اس خیال کا فوراً علاج فرماتے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے شیخ کو مکائد نفس سے بچانے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ لہٰذا جب کبھی اپنا کوئی عمل اچھا معلوم ہو، اس کو اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنے شیخ کی طرف منسوب کردو کہ یہ جو کچھ ہے وہ میرے شیخ کا فیض ہے۔

عمل خود کرو پھر اس کو شیخ کی طرف منسوب کرو

ہمارے حضرت والا نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ فرما رہے تھے، وعظ کے دوران آپ کے اوپر ایک حال طاری ہو گیا اور جوش میں آکر زور زور سے یہ فرمانے لگے "یہ اس حاجی کا فیض ہے، یہ اس حاجی کا فیض ہے۔" لہٰذا خوب سمجھ لو کہ نہ تو شیخ کے واسطے کی ناقدری کرو کہ شیخ تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں، سب کچھ میں ہی کر رہا ہوں، اور نہ یہ سمجھو کہ جو کچھ کرے گا شیخ ہی کرے گا، مجھے کچھ نہیں کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، یہ دونوں انتہائی غلط ہیں، اور حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ عمل خود کرو، اپنے اختیار کو استعمال کرو، اپنی ہمت کو استعمال کرو، اور اس ہمت کی تقویت کے لئے شیخ کی برکت اور دعا کو معین سمجھو۔

تمہیں ایسا ہی سمجھنا چاہئے

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، وہ ایک دن حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس آئے اور اپنے اچھے حالات بیان کئے، اور کہا کہ حضرت! یہ سب آپ کا فیض ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ تمہیں ایسا ہی سمجھنا چاہئے، البتہ میں اس کی حقیقت بتاتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اچھائی تمہارے اندر موجود تھی، میری رہنمائی کی وجہ سے اب وہ ظاہر ہو گئی، باقی تمہیں یہی سمجھنا چاہئے کہ یہ حاجی صاحب کا فیض

ہے۔ پھر ایک قصہ سنایا۔

ایک قصّہ

وہ یہ کہ ایک عورت اپنی پڑوسن کے گھر آگ لینے گئی۔ پہلے زمانے میں لکڑی اور کوئلہ جلایا جاتا تھا، اگر چولہا ٹھنڈا ہے تو اس کو گرم کرنے میں بہت دیر لگتی تھی، ایسے موقع پر اگر کسی پڑوسن کے چولہے میں آگ ہوتی تو وہ عورت اس کے چولہے سے ایک انگارہ اٹھا کر لے آتی، اس سے چولہا سلگانے میں آسانی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا یہ عورت بھی اپنی پڑوسن کے گھر گئی اور پڑوسن سے کہا کہ بی! میرے گھر میں آگ نہیں ہے، اگر اجازت ہو تو تمہارے چولہے سے آگ لے لوں، پڑوسن نے کہا کہ میرا چولہا تو ٹھنڈا ہے اس میں تو آگ ہے ہی نہیں۔ اس عورت نے کہا کہ بہن! اگر اجازت ہو تو چولہے کو کرید کر دیکھ لوں، ہو سکتا ہے کہ کوئی چنگاری مل جائے، پڑوسن نے کہا کہ کرید کر دیکھ لو، چنانچہ اس عورت نے کڑچھے سے چولہے کو کریدا تو اندر سے ایک چھوٹی سی چنگاری نکل آئی، اس عورت نے کہا کہ بس میرا تو کام بن گیا، اور وہ چنگاری لے کر چلی گئی۔

یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ چنگاری اس کے چولہے میں موجود تھی، اگر چنگاری نہ ہوتی تو یہ عورت ہزار مرتبہ بھی اپنا کڑچھا چلاتی تب بھی چنگاری نہ نکلتی، لہٰذا چنگاری تو پہلے ہی موجود تھی، لیکن وہ چنگاری اس کے کڑچھا چلانے سے نکلی، اگر یہ

کڑچھانہ چلاتی وہ چنگاری بھی رفتہ رفتہ بجھ کر ختم ہو جاتی۔

شیخ کڑچھا چلانے والا ہے

اسی طرح شیخ درحقیقت چولہے میں کڑچھا چلانے والا ہے، وہ چنگاری تو خود مرید کے اندر موجود ہوتی ہے، لیکن اگر شیخ اس کے اندر کڑچھانہ چلاتا تو وہ چنگاری وہیں پڑے پڑے ختم ہو جاتی، اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاتا، لیکن شیخ کڑچھا چلا کر اس کو فائدہ مند اور نافع بنادیتا ہے۔ لہٰذا شیخ بیکار بھی نہیں، اس لئے کہ کڑچھا وہی چلا رہا ہے، اگر وہ کڑچھانہ چلاتا تو چنگاری کیسے نکلتی، اور شیخ فاعل حقیقی بھی نہیں، کیونکہ چنگاری تو پہلے سے موجود تھی، بس شیخ نے اس کو نکال کر اس سے کام لیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی خوبصورت مثال سے اس بات کو سمجھا دیا۔

شیخ کو نعمت عظمیٰ سمجھے

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے بارہا سنا کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور آپ کے عاشق تھے، ایک دن حضرت مفتی صاحب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمانے لگے کہ حضرت! یوں خیال ہوتا ہے کہ اگر ساری عمر اللہ جل شانہ کے حضور سجدے میں پڑا رہوں اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے کہ اس خانقاہ سے وابستگی ہو گئی تو بھی حق شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سنا تو کوئی تردید نہیں فرمائی، اور فرمایا کہ

ہاں بھئی آپ کو ایسا ہی سمجھنا چاہئے، کیونکہ طالب کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو شیخ کا تابع اور ممنونِ احسان سمجھے، اور یہ سمجھے کہ یہ شیخ میرے لئے نعمت عظمیٰ ہیں۔ بہر حال اسی کا نام ہے "اعتدال" کہ آدمی نہ اس طرف جھکے اور نہ اُس طرف جھکے، اور اسی کا نام سنّت اور شریعت اور طریقت کا امتزاج ہے جس کے اندر ہر چیز اس کی حد پر ہو، اس حد سے آگے نہ بڑھے، یہی ساری طریقت ہے۔

شریعت، سنّت اور طریقت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی اچھی بات فرمایا کرتے تھے جو یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ دیکھو شریعت نام ہے حقوق کا، کس کے حقوق کا؟ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کا، اور ساری شریعت انہی دو چیزوں کے درمیان دائر ہے۔ "سنّت" نام ہے حدود کا، یعنی ان حقوق کو کس طرح ادا کیا جائے؟ اور کن حدود میں رہ کر ادا کیا جائے؟ یہ چیز سنّت سے معلوم ہوتی ہے۔ "طریقت" نام ہے "حفظ حدود" کا، یعنی حقوق کی جو حدودؔ ہیں، ان کی کیسی حفاظت کی جائے کہ آدمی کا ایک قدم بھی نہ آگے بڑھے اور نہ ایک قدم پیچھے ہو، بس حد پر جاکر آدمی رک جائے، یہ حفظ حدود "طریقت" کے ذریعہ انجام پاتی ہیں، یعنی شیخ کے پاس جاکر آدمی کا مزاج اس طرح بن جاتا ہے کہ ان حدود کی حفاظت کرنا اس کو آجاتا ہے۔ بہر حال وہ تین جملے فرمایا کرتے تھے کہ:

شریعت .... نام ہے حقوق کا

سنّت .... نام ہے حدود کا

طریقت .... نام ہے حفظ حدود کا

لٰہذا پیری مریدی کا جو سارا سلسلہ ہے کہ شیخ کے پاس جانا اور اپنی اصلاح کرانا، ان سب کا مقصد "حفظ حدود" ہے یعنی کتنا کام کروں، اور کہاں جاکر رک جاؤں، اس سے آگے نہ بڑھوں۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس کو دو اور دو چار کر کے دو ٹوک طریقے سے بتانا مشکل ہے، جب تک اس کا تجربہ نہ کرایا جائے اور اس کی مشق نہ کرائی جائے اور اس کی عادت نہ ڈالوائی جائے۔

شیخ کو اس کے مقام پر رکھو

تو شیخ کا مقام بھی یہی ہے کہ اگر شیخ کی ناقدری ہو جائے، اللہ بچائے بڑے وبال کی بات ہے، اور اگر شیخ کو اس کے مرتبہ سے آگے بڑھا دیا جائے اور اس کو خدا بنا دیا جائے، اللہ بچائے، یہ شرک کا مقام ہے، ان دونوں حدوں کے درمیان رہ کر کس طرح چلے؟ یہ بھی شیخ ہی بتاتا ہے، جس طرح حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بتائی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۳۰

ہمت اور اخلاص

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۰

صفحات : ۱۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۳۰

ہمّت اور اخلاص

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبّ العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔ والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم۔ وعلیٰ آله وأصحابه اجمعین۔

أمّا بعد!

استحضار و ہمت کا نسخہ اصلاح کیلئے اکسیر ہے

حضرت والا نے فرمایا کہ:

''اخلاص و ہمّت'' خلاصہ تصوف ہیں، ان دونوں میں بھی اصل چیز ''ہمت'' ہے، کیونکہ اخلاص پیدا کرنے کے لئے بھی ہمت ہی کی ضرورت ہوگی، اور ''ہمّت''

کا معین "استحضار" ہے اور "استحضار" کی صورتیں مختلف ہیں، جو صورت شیخ تجویز کردے اس پر عمل کرے، مثلاً ہر کوتاہی پر دس رکعت نفل یا کم و بیش نفل بطور جرمانہ ادا کرنا، تاکہ جب دوسرا موقع کوتاہی کا پیش آئے تو جرمانہ کے خوف سے "استحضار" کی کیفیت پیدا ہو جائے، اور جب "استحضار" ہو جائے تو فوراً ہمت سے کام لے اور تقاضائے نفس کو مغلوب کرے، اگر "استحضار" اور "ہمّت" سے کام لے گا تو انشاء اللہ کوتاہیوں سے محفوظ رہے گا اور رفتہ رفتہ اصلاح ہو جائے گی، اور ہر روز مطالعہ "نزہۃ البساتین" سے بھی قوت استحضار و ہمّت کو پہنچتی ہے۔

جو گر حضرت نے فرمایا ہے استحضار و ہمّت کا
سراسر نسخہ اکسیر ہے اصلاح امّت کا

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵)

اخلاص کی اہمیت

اس ملفوظ میں حضرت والا نے جو دو چیزوں کا بیان فرمایا ہے وہ سارے "تصوف اور طریقت" کا خلاصہ ہیں، جن کی تحصیل اس راستے میں کرنی پڑتی ہے، اور ہم "تصوف و طریقت" جس کو کہتے ہیں وہ حقیقت میں

دین کا راستہ ہے، گویا کہ دین کے راستے پر چلنے کے لئے دو چیزیں انتہائی ضروری ہیں، ان کے بغیر دین کا راستہ قطع نہیں ہو سکتا، ایک اخلاص، یعنی ہر عمل خالصۃً اللہ کے لئے ہو، اللہ کی خوشنودی اور اللہ کی رضاجوئی کے لئے ہو، اس عمل میں ریاکاری کے، شہرت،حبّ جاہ کے، تعریف پسندی کے دسائس نہ ہوں۔ اور یہ اخلاص تمام اعمال کی روح ہے، اگر اخلاص حاصل نہیں العیاذ باللہ، تو سارے اعمال اکارت ہیں، بے کار ہیں، مثلاً نماز پڑھ رہا ہے لیکن دکھاوا مقصود ہے، یا مثلاً روزے رکھ رہا ہے لیکن اس کے ذریعہ لوگوں کی تعریف حاصل کرنا منظور ہے، یا مثلاً تلاوت کر رہا ہے لیکن اس کے ذریعہ حُبِّ جاہ مقصود ہے، تو یہ سارے اعمال اکارت ہیں، ان اعمال کا کوئی وزن نہیں، ایک دمڑی کے برابر ان کی قیمت نہیں۔ بہر حال!ایک چیز تو ہے "اخلاص" اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔

دوسری چیز "ہمت"

دوسری چیز "ہمت" ہے، "اخلاص" کے ساتھ عمل صالح کرنے کی اور اطاعت باری تعالیٰ کرنے کی اور گناہوں سے بچنے کی ہمت ہو۔ اور سارے تصوف اور طریقت کا خلاصہ یہی ہے کہ اپنے اعمال کے اندر "اخلاص" پیدا کرنا اور "ہمت" پیدا کرنا۔ اگر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں تو سمجھو کہ میدان مار لیا اور منزل حاصل ہو گئی۔ یہ بات حکیم الامتؒ کہہ رہے ہیں، جو اس میدان تصوف کی خاک چھاننے کے بعد اپنی پوری زندگی کے

تجربات کا، اپنے علم و معرفت کا، اپنی ریاضت اور مجاہدات کا نچوڑ بتارہے ہیں کہ دو چیزیں حاصل کرنے کی ہیں، ایک "اخلاص" اور دوسری "ہمت"۔

صدق اور اخلاص

اگر اس بات کو دوسرے الفاظ سے تعبیر کیا جائے تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "صدق" اور "اخلاص" یہ دو چیزیں مطلوب ہیں۔ "اخلاص" کے معنی یہ ہیں کہ نیت خالص اللہ کے لئے ہو، اور "صدق" کے معنی یہ ہیں کہ وہ عمل صحیح ہو، مستقیم ہو اور شریعت میں اس عمل کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس طریقے کے مطابق ہو، یعنی سنّت کے مطابق ہو۔ اس کا نام "صدق" ہے۔

مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھایا، اور اس طریقے پر ہاتھ اٹھائے جس طرح اٹھانا مسنون ہے، اور سنّت کے مطابق قیام کیا، سنّت کے مطابق رکوع کیا، سنّت کے مطابق سجدہ کیا، سارے اعمال سنّت کے مطابق انجام دیئے، اسی کا نام "صدق" ہے۔ اور اس نماز پڑھنے سے مقصود اللہ جل شانہ کی رضاجوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنی مقصود ہے، دکھاوا مقصود نہیں، ریاکاری مقصود نہیں، اسی کا نام "اخلاص" ہے، ان دونوں چیزوں کے ملنے سے عمل میں جان پڑتی ہے، اگر "اخلاص" نہ ہو، صرف "صدق" ہو، مثلاً بہت خشوع اور خضوع سے نماز پڑھی اور سارے اعمال سنّت کے مطابق انجام دیئے، اس میں صدق تو پایا

گیا لیکن دل میں کھوٹ تھا، اخلاص نہیں تھا، اس لئے وہ عمل اکارت گیا۔

"صدق" بھی ضروری ہے

اور اگر "اخلاص" ہے اور عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے علاوہ کچھ مقصود نہیں، لیکن اس عبادت کا طریقہ غلط اختیار کرلیا، وہ طریقہ سنّت کے مطابق نہیں، شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں، مثلاً نماز جلدی جلدی اٹھک بیٹھک کر کے پڑھ لی، اور جس طرح تعدیل ارکان کرنا تھا، ویسا نہیں کیا، تو اس نماز کے اندر "اخلاص" تو تھا، اس لئے کہ مقصود اللہ کو راضی کرنا تھا، لیکن وہ نماز سنّت کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے مقبول نہیں۔ ایسی نماز پڑھنے والے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قم فصلّ فانك لم تصل" کھڑے ہو کر دوبارہ نماز پڑھو، اس لئے کہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ لہٰذا نہ تنہا نیّت کی درستی کافی ہے، نہ تنہا عمل کی درستی کافی ہے، بلکہ جب دونوں کا امتزاج ہوگا، یعنی نیّت بھی درست ہوگی اور عمل بھی درست ہوگا، تب وہ عمل وزنی ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیّ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی "بدعات" ہیں، ان سب کے اندر "اخلاص' پایا جاتا ہے، اس لئے کہ عام طور پر جو لوگ "بدعات" کرتے ہیں، وہ اس عمل کو نیکی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے وہ عمل کرتے ہیں، لیکن

چونکہ طریقہ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر "صدق" نہیں، اس لئے وہ عمل اکارت اور بیکار ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔

(سورۃ الکہف، آیت ۱۰۳، ۱۰۴)

ان اعمال کے کرنے والوں کی نیت درست تھی، لیکن طریقہ چونکہ درست نہیں تھا، اس لئے وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہوا۔ بہرحال، یہ دونوں چیزیں یعنی "اخلاص" اور "صدق" دونوں مطلوب ہیں۔

صدق اور اخلاص کے حصول کا ذریعہ

اور ان دونوں کو حاصل کرنے کے لئے "ہمت" کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہمت کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کا نفس اس کو دوسرے راستے پر لے جا رہا ہے تو اس نفس کو روک کر اور اس کے تقاضے کی مخالفت کر کے آدمی سیدھے راستے پر رہے اور سیدھا عمل اختیار کرے، اسی کا نام "ہمت" ہے۔ مثلاً دل میں یہ شدید تقاضہ پیدا ہو رہا ہے کہ اپنی نگاہ کو ایسی جگہ پر ڈالوں جس سے لذت حاصل ہو، نفس کے اس تقاضے کو روکا اور اس کی مخالفت کی، اس مخالفت کرنے کا نام "ہمت" ہے۔ اس لئے کہ یہ مخالفت ہمت سے ہوتی ہے، جتنے بھی اعمال ہیں چاہے، وہ ایجابی ہوں جیسے اوامر کو

بجالانا، یا سلبی ہوں جیسے نواہی سے بچنا، ان سب میں ”ہمّت“ کے استعمال کی ضرورت ہے، جب ہمّت سے کام لے گا تو وہ کام ہوگا، ورنہ وہ کام نہیں ہوگا۔

مثلاً روزہ رکھنے کے لئے اور سحری کھانے کے لئے اٹھنا ہے، مگر شدید نیند آرہی ہے، سردی لگ رہی ہے، اٹھنا مشکل ہو رہا ہے، اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، لیکن ہمّت کر کے اٹھا اور یہ سوچا کہ اگر نہیں اٹھونگا تو سحری نکل جائے گی، سحری نکل جانے کے نتیجے میں یا تو روزہ جائے گا یا وہ روزہ ناقابل برداشت ہوگا، یہ سوچ کر اس نے ہمّت کی اور نفس کا جو تقاضہ تھا اس کو پامال کیا، اس کی مخالفت کی، اور اٹھ کر سحری کھاکر روزہ رکھ لیا، اسی کا نام ہمت ہے، اسی طرح پورے دین پر عمل کرنے کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اصل ”ہمّت“ ہی ہے

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ سارے اعمال کا خلاصہ اخلاص اور ہمّت ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ ان دونوں چیزوں میں بھی اصل ”ہمّت“ ہی ہے، کیونکہ اخلاص پیدا کرنے کیلئے بھی ”ہمتّ“ کی ضرورت ہوتی ہے، اخلاص بھی ”ہمّت“ کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ جب انسان مثلاً نماز پڑھنے کے لئے جاتا ہے تو اب نفس و شیطان اس کے دل میں ایک چرکہ لگاتے ہیں کہ آج جب تو نماز کے لئے کھڑا ہوگا اور لوگ تجھے دیکھیں گے تو

تجھے متقی پرہیزگار اور بڑا عابد و زاہد سمجھیں گے، چنانچہ وہ خود بھی لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنی نماز میں اور زیادہ خشوع و خضوع پیدا کرے گا۔ اب شیطان اور نفس نے لوگوں کو دکھانے کی جو بات دل میں ڈال دی ہے اس سے نجات کے لئے بھی "ہمت" کی ضرورت ہے، وہ "ہمت" یہ کہ دل میں یہ سوچے کہ اس مخلوق کو چھوڑو، اس لئے کہ مخلوق کی تعریف اور مخلوق کی مذمت کا کیا اعتبار، اگر یہ خوش ہو جائیں تو کیا اور برائی کریں تو کیا؟ اس طرح سوچ کر دکھاوے کا جو خیال دل میں آیا تھا اس کو نکالے، لیکن اس کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہے، ورنہ نفس کا تقاضہ تو یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی تعریف سے مزہ لو، لیکن اس تقاضے کو دل سے نکالنے کیلئے ہمت کرنی پڑتی ہے۔

تعریف سے دل میں گھمنڈ پیدا ہوتا ہے

لوگ جب کسی کی تعریف کرتے ہیں کبھی اس کے علم کی تعریف کر دی، کبھی اس کے عمل کی تعریف کر دی، کبھی اس کے اخلاق کی تعریف کر دی، تو جس کی تعریف کی جاتی ہے اس کو بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اتنے سارے لوگ میرے علم کی تعریف کر رہے ہیں، اس تعریف کے نتیجے میں رفتہ رفتہ دل میں یہ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ اتنے سارے بلاوجہ تو تعریف نہیں کر رہے، ضرور میرے اندر علم ہوگا، تبھی تو یہ لوگ میری تعریف کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس تعریف کے ذریعہ انسان گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس

لئے یہ تعریف بڑی خراب چیز ہے، اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ انسان کو خراب کر دیتی ہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ:

اُحْصُوْا فِیْ وُجُوْہِ الْمَدَّا حِیْنَ التُّرَابَ

یعنی تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو۔

دل میں پیدا ہونے والے گھمنڈ کا علاج

لہٰذا اگر کوئی تمہاری تعریف کرے، اس کے نتیجے میں دل میں گھمنڈ پیدا ہو رہا ہو تو اس کا علاج کرے، اس کا علاج یہ ہے کہ دل میں فوراً اس کا استحضار کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے پر میرے محاسن ظاہر فرما دیئے ہیں، اگر کہیں میرے عیوب اس پر ظاہر ہو جاتے تو یہ شخص مجھ سے نفرت کرتا۔ اور ساتھ میں یہ سوچے کہ اس کی تعریف سے مجھے کیا حاصل ہو گا؟ ایک مرتبہ جب اس نے تعریف کی تو سن کر بڑا مزہ آیا، لیکن وہ مزہ سننے کے بعد ختم ہو گیا، لہٰذا اس مزے کو برقرار رکھنے کے لئے اس تعریف کرنے والے سے کہو کہ ذرا ایک مرتبہ اور میری تعریف کر دیں، کیا اس سے یہ درخواست کر سکتے ہو؟ نہیں کر سکتے، البتہ اس نے جو ایک مرتبہ تعریف کی، بیٹھے ہوئے اس کا تصور کرتے رہو کہ اس نے کتنی اچھی بات کہی تھی، کیسا مزہ آیا تھا، لیکن اس تصور سے کونسا دنیا کا یا دین کا فائدہ حاصل ہو گا؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعریف کرنے پر ایک بہت اچھا شعر سنایا کرتے تھے، اگر انسان اس کا استحضار کر لے تو تعریف کے فتنے سے

ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔ فرماتے کہ ؎

سرد ہو جاتی ہے حُبِّ جاہِ دنیا جس کے بعد
اک ذرا سی بات ہے اے دل کہ پھر کیا اس کے بعد؟

یعنی جب کوئی شخص تعریف کر رہا ہو کہ آپ کا علم بہت اعلیٰ ہے، آپ بڑے اعلیٰ درجے کے مفتی ہیں، آپ اچھے مقرر ہیں، آپ اچھے مصنّف ہیں، آپ نے بڑی اچھی کتاب لکھی، آپ نے بڑا اچھا درس دیا، آپ نے بڑا اچھا وعظ کہا۔ اس وقت یہ ذرا سی بات سوچ لو کہ اے دل پھر کیا ہے اس کے بعد؟ یعنی اس کی تعریف کے بعد کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، جو تعریف اس نے کی تھی وہ ہوا میں اڑ گئی۔

مزہ تو اس وقت ہے

ارے مزہ تو اس وقت ہے جب اللہ تعالیٰ یہ فرمادیں کہ:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِی ○

(سورۃ الفجر، آیت ۲۷ تا ۳۰)

مزہ تو اس وقت ہے، اس کو سوچو اور اس کی فکر کرو، یہ کیا کہ دوسرے کی تعریف پر خوش ہوگیا کہ فلاں نے مجھے اچھا کہدیا، فلاں نے میری تعریف کردی، لیکن چونکہ انسان کا نفس عجلت پسند ہے، اس لئے جو

فوری تعریف ہو رہی ہے، اس کی طرف بھاگتا ہے، اس کی طرف اس کو کشش اور میلان ہوتا ہے، پھر اس کشش اور میلان کے نتیجے میں انسان یہ چاہتا ہے کہ میں اور اچھا کام کروں تاکہ اور اپنی تعریف سنوں، اب نفس دوبارہ تعریف کرانے کے لئے وہ کام کرارہا ہے۔ لہٰذا نفس کو اس خیال سے ہٹانے کے لئے اور اس کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے "ہمت" کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ "ہمت" اس لئے اصل ہے کہ "اخلاص" کے حاصل کرنے کیلئے ہمت کی ضرورت ہے، اگر "ہمت" نہ ہو تو اخلاص بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان "ہمت" حاصل کرنے کی فکر کرے اور اس کو اپنے اندر پیدا کرے۔

"ہمت" کے اندر بڑی طاقت ہے

دیکھو! اللہ تعالیٰ نے انسان کی "ہمت" میں بڑی زبردست طاقت رکھی ہے، یہی "ہمت" ہے جس نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا، سو سال پہلے چاند پر جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس وقت اگر یہ کہا جاتا کہ چاند پر چلے جاؤ، تو سامنے والا سن کر یہ جواب دیتا کہ تو پاگل ہو گیا ہے، تیرا دماغ خراب ہے۔ اس زمانے میں انسان کے ہوا میں اڑنے کو ناممکن اور محال سمجھا جاتا تھا۔

ہوا میں اڑنے کا ایک واقعہ

چنانچہ عربی کی مشہور لغت ہے "صحاح" اس کے مصنف اسماعیل بن حماد جوہری گزرے ہیں، جو عربی لغت کے امام مانے جاتے ہیں، ان کو بعض لوگوں نے "عقلاء المجانین" میں شمار کیا ہے، یعنی وہ تھے تو بڑے عاقل، پھر بھی حماقت کرلی، ان کے دماغ میں یہ احمقانہ خیال آیا کہ میں ہوا میں اڑوں، چنانچہ انہوں نے پہلے تو ہوا میں اڑنے کی ریاضت اور مشق کی، کچھ عرصہ تک مشق کرنے کے بعد ایک دن انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ آج میں جامع مسجد کے مینار کے اوپر سے لوگوں کو اڑ کر دکھاؤں گا، چنانچہ اعلان سن کر ہزاروں افراد وہاں جمع ہوگئے، اور یہ مینار پر چڑھ گئے اور وہاں سے اپنے اڑنے کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ اسی مظاہرے کے دوران دھڑام سے نیچے گرے اور وہیں انتقال ہو گیا۔ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ "عقلاء المجانین" میں سے تھے۔ بہرحال اس زمانے میں اڑنے کی کوشش کو حماقت سمجھا جاتا تھا، لیکن اسی ہمت نے ترقی کی، ترقی کرتے کرتے انسان نے اڑنا شروع کر دیا۔

ہوا میں سب سے پہلا اڑنے والا انسان مسلمان تھا

سب سے پہلا انسان جو ہوا میں اڑا وہ ترکی کا ایک مسلمان تھا۔ لوگوں نے یہ غلط مشہور کر رکھا ہے کہ سب سے پہلے رائٹ برادران نے ہوائی جہاز ایجاد کیا، لیکن صحیح یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اڑنے کا جو حقیقی

مظاہرہ کیا ہے وہ خلافت عثمانیہ کے دور میں ترکی کے ایک مسلمان نے کیا، آج بھی اس کے پر استنبول میں "برج غلاطہ" میں لٹکے ہوئے ہیں، جن پروں سے اس نے اڑنے کا مظاہرہ کیا تھا، ان سے آٹھ میل کی مسافت اڑ کر طے کی، بُرج غلاطہ سے اڑا اور "آبنائے باسفورس" کو عبور کیا، آٹھ میل اڑنے کے بعد اپنی پرواز ختم کی۔ وہ دنیا میں اڑنے والا سب سے پہلا انسان تھا۔

"ہمّت" نے کہاں پہنچادیا

وہ کس طرح اڑا؟ ہمّت کے ذریعہ، پھر اسی ہمّت نے اور ترقی کی تو ہوائی جہاز کی شکل اختیار کرلی۔ ابتداء میں ہوائی جہاز ایسے ہوتے تھے کہ اس میں بیٹھنا بھی مشکل تھا، اسی ہمّت نے اور ترقی کی تو پنکھے کا جہاز ایجاد ہوگیا، اور ہمّت نے ترقی کی تو "جیٹ" جہاز ایجاد ہوگیا، اور ہمّت نے ترقی کی تو "کنکارڈ" ایجاد ہوگیا، ہمّت نے اور ترقی کی تو انسان خلا میں پہنچ گیا۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس ہمّت کو جہاں چاہے لگادے، چاہے اچھے کام میں لگا دے، چاہے برے کام میں لگادے۔

"ہمّت" کرشمے دکھائے گی

لیکن تم اس "ہمّت" کو اچھے کام میں لگاؤ اور اس "ہمّت" کے ذریعہ

اپنی نفسانی خواہشات کو مسخر کرو، ناجائز اٹھنے والے تقاضوں کو دبانے میں اس ہمّت کو استعمال کرو، پھر دیکھو کہ یہ "ہمّت" تمہیں کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔

ہمّت کیسے پیدا ہو؟

پھر اس ہمّت کو پیدا کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اہل ہمّت کی صحبت اختیار کرو، ان کے پاس اٹھو بیٹھو، رفتہ رفتہ ان کی "ہمّت" تمہاری طرف بھی منتقل ہو جائے گی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اہل ہمّت کے حالات پڑھو، اس کے ذریعہ ان کی ہمّت تمہاری طرف منتقل ہو گی۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہمّت کا استحضار کرو، مثلاً یہ کہ کسی عبادت میں کوتاہی ہو جانے پر اپنے لئے کچھ سزا مقرر کرلو، اسی طرح گناہ ہو جانے پر سزا مقرر کرلو، مثلاً یہ کہ اگر میں نے فلاں گناہ کرلیا، اور ہمّت کرکے اس گناہ سے نہ رکا تو میں اتنی رکعتیں نفل پڑھوں گا یا اتنے پیسے صدقہ کروں گا۔ البتہ یہ سزا نہ تو بہت زیادہ ہو کہ آدمی اس سزا پر عمل ہی نہ کرسکے، اور نہ اتنی معمولی سزا ہو کہ اس کی اہمیت ہی معلوم نہ ہو بلکہ گناہ ہو جانے پر چار رکعت یا چھے رکعت مقرر کرلو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب نفس اس گناہ پر اکسائے گا تو اس وقت یہ خیال آئے گا کہ اگر میں نے یہ گناہ کرلیا تو مجھے چھے رکعتیں پڑھنی پڑیں گی، اور اس کے نتیجے میں اس گناہ سے بچنے کی ہمّت میں پختگی پیدا ہو جائے گی۔

شیخ کی ضرورت

لیکن ہر آدمی کی "ہمت" کو بڑھانے اور اس سے کام لینے کا طریقہ الگ ہوتا ہے، ایک ہی نسخہ ہر ایک کو گھونٹ کر نہیں پلایا جاسکتا، اس لئے شیخ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس آدمی کی ہمت کو کام میں لانے کے لئے کونسا طریقہ مناسب ہوگا؟ اگر تم اپنی خود رائی سے کرو گے تو بعض اوقات ٹھوکر کھا جاؤ گے۔ اور کسی شیخ سے تعلق رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے لئے تمہارے مناسب حال ایک طریقہ متعین کر دیتا ہے جو تمہاری "ہمت" کو کام میں لانے کے لئے مناسب ہوگا۔

خلاصہ

آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ سارے دین پر عمل کرنے کے لئے سب سے بنیادی چیز "ہمت" ہے، اور اس "ہمت" کو تقویت دینے کے لئے اہل ہمت کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا چاہئے اور اہل ہمت کے حالات اور ان کے ملفوظات پڑھنا چاہئے۔ اس کے ذریعہ رفتہ رفتہ انسان کے اندر خود بخود "ہمت" پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ سب کام کسی شیخ کی نگرانی مین ہی کرنا چاہئے، اس کے بغیر بعض اوقات غلطی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۱

اعمال میں رسوخ پیدا کریں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۱

صفحات : ۲۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ؕ

مجلس نمبر ۳۱

اعمال میں رسوخ پیدا کریں

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علٰی رسوله الكریم ۔
وعلی آله واصحابه اجمعین ۔
أمّا بعد!

حال کی دو قسمیں

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

"تصوّف میں" رسوخ اعمال اختیاریہ مطلوب ہے، نیز مامور بہ محبّت عقلی ہے نہ کہ طبعی۔

حال کے دو معنی ہیں: ایک تو کیفیت غیر اختیاریہ، دوسرے رسوخ اعمال اختیاریہ۔ دوسرے معنی میں حال کا ترتب لازم ہے، کیونکہ وہ موعود ہے۔

ففی الحدیث: کذلك الایمان اذاخالطه بشاشة القلوب (ایمان کی یہی صورت ہوتی ہے جب اس کی بشاشت دلوں میں بیٹھ جائے)

(حدیث ہرقل، بخاری، باب بدء الوحی)

وفی کلام اللّٰہ تعالیٰ:

فَمَنْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَهْدِیَه' یَشْرَحْ صَدْرَه' لِلْاِسْلَامِ

(جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت پر ڈالنا چاہتے ہیں، اس کے سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں)

(سورۃ الانعام، آیت ۱۲۵)

اور تصوّف میں یہی حال مطلوب ہے، جب کوئی شخص اعمال صالحہ بتکلّف اختیار کرتا ہے تو رفتہ رفتہ ان اعمال میں سہولت ہونے لگتی ہے اور ایک کیفیت راسخہ پیدا ہو جاتی ہے، اور گو یہ کیفیت رسوخ بذاتہ غیر اختیاری ہے، لیکن بایں معنی اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری

ہیں یعنی اعمال صالحہ، مثلاً محبّت حق تعالیٰ کے ساتھ پیدا کرنا واجب ہے۔ کیونکہ نصوص میں اسکی تحصیل کا امر ہے، بخلاف شوق و ذوق کے کہ اس کی تحصیل کا کہیں بھی امر نہیں۔ جس محبّت کی تحصیل مامور بہ ہے وہ عقلی ہے، اور محبّت عقلی اختیاری ہے، بخلاف محبّت طبعی کے کہ وہ غیر اختیاری ہے، اس لئے مامور بہ بھی نہیں۔

(انفاس عیسیٰ ص ١٦)

غیر اختیاری کاموں پر مؤاخذہ نہیں

حضرت والا نے اس ملفوظ میں دو مضمون بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ انسان ان کاموں کا مکلّف ہوتا ہے جو اس کے اختیار میں ہیں، جو کام انسان کے اختیار سے باہر ہیں وہ انسان کی تکلیف یعنی ذمہ داری سے خارج ہیں، انسان ان کی بجا آوری کا پابند نہیں اور نہ انسان کو ان کی تحصیل کا حکم دیا گیا۔ قرآنِ کریم کا صاف ارشاد ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَھَا۔

(سورۂ بقرہ: آیت ۲۸٦)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی نفس کو کسی ایسے کام کا مکلّف نہیں کرتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو، اختیاری امور کا انسان مکلّف ہے، غیر اختیاری امور کا

مکلّف نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی غیر اختیاری کام ایسا ہے جس کو انسان نہیں کر سکا تو اس پر انسان کی پکڑ اور مؤاخذہ نہیں ہوگا کہ تم نے یہ عمل کیوں نہیں کیا، کیونکہ وہ عمل اس کے اختیار سے باہر تھا۔

"حال" کی پہلی قسم، کیفیت غیر اختیاریہ

ذکر و شغل کے اثرات کی وجہ سے انسان پر طاری ہونے والی کیفیات کو صوفیاء کی اصطلاح میں "حال" کہتے ہیں۔ جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز اس کا حال ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس حال کی دو قسمیں ہیں:

حال کی ایک قسم ہے کسی کیفیت غیر اختیاریہ کا پیدا ہو جانا۔ مثلاً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کا نام آئے یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو اس کو سن کر بے اختیار گریہ طاری ہو جائے۔ چنانچہ بعض اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گرامی آتے ہی ان کی طبیعت میں ایسی رِقّت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے گریہ طاری ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ ایک حال اور کیفیت ہے، لیکن یہ کیفیت غیر اختیاری ہے، اس لئے کہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب چاہے اپنے اوپر گریہ طاری کرلے اور جب چاہے آنسو بہا دے اور جب چاہے رک جائے، عام طور پر یہ فعل انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یا مثلاً بعض اللہ کے بندوں پر کسی خاص موقع پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اس کو بھی "حال" غیر اختیاری کہا جاتا ہے۔

”حال“ کی دوسری قسم، اعمال میں رسوخ

”حال“ کی دوسری قسم یہ ہے کہ اعمال صالحہ میں ثابت قدمی اور رسوخ پیدا ہو جائے، اس کو بھی صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ”حال“ کہا جاتا ہے، لیکن یہ حال بالمعنی الثانی ہے، یعنی کسی عمل صالح کے اندر اتنا رسوخ پیدا ہو گیا اور اتنی پختگی اور ثابت قدمی آ گئی کہ وہ عمل صالح انسان کی طبیعت ثانیہ بن گیا، مثلاً نماز ہے، جب بچپن میں اس کو پڑھنا شروع کیا تھا تو اس وقت بہت بھاری معلوم ہوتی تھی، اور پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا، کبھی پڑھی کبھی نہیں پڑھی، لیکن والدین نے اور استادوں نے زبردستی نماز پڑھنے پر لگا دیا، اب رفتہ رفتہ نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی اور اس میں رسوخ پیدا ہو گیا، اور اس درجہ کا رسوخ پیدا ہو گیا کہ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک لاکھ روپے لے لو اور نماز چھوڑ دو، تو انشاء اللہ نمازی آدمی نماز نہیں چھوڑے گا، چاہے اس کو کوئی کتنا ہی لالچ دیدے یا اس کے گلے پر تلوار رکھ دے، یا نفس میں کیسا ہی تقاضہ سستی اور کاہلی کا آ جائے۔ اسکو ”رسوخ“ اور ”ثابت قدمی“ بھی کہا جاتا ہے اور اسی کو ”حال بالمعنی الثانی“ کہا جاتا ہے، یعنی نماز اس شخص کا ”حال“ بن گئی، طبیعت ثانیہ بن گئی، اب وہ نہیں چھوٹے گی۔

”حال“ کی پہلی قسم مطلوب نہیں

حضرت والا فرماتے ہیں کہ ”حال“ کی پہلی قسم یعنی غیر اختیاری

کیفیات کا صادر ہونا، مثلاً گریہ طاری ہو رہا ہے، دل اُمڈ رہا ہے، سرور طاری ہو رہا ہے، عبادت میں لطف آرہا ہے، یہ چیزیں نہ تو بذات خود مطلوب ہیں، نہ ہی آخرت میں ان کے بارے میں سوال ہوگا کہ ہمارا نام آنے پر تم کیوں نہیں روئے؟ تمہارے آنسو کیوں جاری نہیں ہوئے؟ اس کا سوال آخرت میں نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ حال غیر اختیاری کیفیت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو نماز کے اندر مزہ نہیں آتا تو کوئی بات نہیں، اس لئے کہ وہ مزہ مطلوب ہی کب ہے، اگر ساری عمر تمہیں نماز کے اندر مزہ نہ آیا، لیکن پھر بھی سنّت طریقے پر نماز پڑھتے رہے تو تمہارا کوئی گھاٹا نہیں، اس لئے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھیں گے کہ تمہیں نماز میں مزہ کیوں نہیں آیا؟ اور چونکہ تمہیں نماز میں مزہ نہیں آیا، لہٰذا ہم تمہیں جہنم میں بھیج رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے، اس لئے کہ مزہ آنا نہ آنا غیر اختیاری فعل ہے، اور غیر اختیاری فعل پر باز پرس اور پکڑ نہیں، اور چونکہ غیر اختیاری ہے اور آخرت میں اس پر پکڑ نہیں، اس لئے اس کے حصول کی فکر میں بھی زیادہ نہیں پڑنا چاہئے۔

احوال محمود ہیں مطلوب نہیں

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے کو واضح کر گئے، ورنہ تصوّف کے اسرار و رموز کے اندر یہ حقیقت چھپ گئی تھی اور لوگوں نے ان کیفیات کو اور ان احوال کو ہی مقصود بنا لیا

تھا، اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ تصوّف کا مقصد ہی یہ ہے کہ یہ احوال اور کیفیات طاری ہوں، عبادت میں مزہ آئے، گریہ طاری ہو، آنسو جاری ہوں، دل چلنے لگے وغیرہ، ان سب چیزوں کو مقصود اصلی بنالیا گیا تھا۔ لیکن حضرت والا نے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کردیا اور دو لفظوں میں بات صاف فرمادی، تاکہ نہ افراط رہے اور نہ تفریط رہے۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ احوال مطلوب نہیں، اگرچہ محمود ہیں، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ احوال عطا فرمادیں تو یہ کوئی بری بات نہیں، اچھی بات ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، لیکن مطلوب اور مقصود نہیں۔ اس لئے ان کے پیچھے مت پڑو، اگر حاصل ہو جائیں تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اگر حاصل نہ ہوں تو بھی اللہ کا شکر ادا کرو کہ الحمدللہ عمل کی توفیق ہوگئی۔

نماز میں مزہ تلاش مت کرو

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت! نماز پڑھتے ہوئے ساری عمر گزر گئی مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آیا، کچھ علاج فرمادیں۔ حضرت نے جواب میں لکھا کہ نماز میں مزہ آنا کوئی ضروری نہیں، تم مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہے ہو یا اللہ تعالیٰ کی بندگی کی خاطر نماز پڑھ رہے ہو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے نماز پڑھ رہا ہوں۔ ارے اگر مزہ کی خاطر نماز پڑھی جارہی ہے تو وہ نماز ہی کیا ہوئی!! نماز تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اس کی بندگی کی خاطر پڑھی جائے، چاہے اس نماز میں

مزہ آئے یا نہ آئے، تکلیف ہو یا مشقّت ہو۔

میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آیا ہو، لطف نہ آیا ہو اور اس پر کبھی سرور کی کیفیت طاری نہ ہوئی ہو، میں اس شخص کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر اس کو نماز کے اندر مزہ آتا یا نماز کے اندر اس کو کوئی کیف و سرور حاصل ہو جاتا تو خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ اسی کو مقصود سمجھ بیٹھتا اور اسی کو حاصل نماز سمجھ لیتا، اس کے نتیجے میں وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے اس کو احوال و کیفیات سے دور رکھ کر گمراہی سے بچالیا۔ بہر حال! عبادات کی ادائیگی میں ان سرور اور کیفیات کے پیچھے مت پڑو، ان کیفیات کی وجہ سے یا تو عجب اور ناز پیدا ہو جاتا ہے یا اس کو اصل مقصود سمجھ لینے سے کسی وقت اس میں کمی آ جانے پر خود کو ناکام اور محروم سمجھ بیٹھتا ہے، دونوں صورتوں میں نقصان ہے۔ اس لئے کیفیات ہر شخص کے لئے موزوں بھی نہیں، لہٰذا ان کی فکر ہی نہ کی جائے۔ بس اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سنّت ہے، اس پر سیدھے سیدھے عمل کرتے چلے جاؤ، اس فکر میں مت پڑو کہ رونا آیا کہ نہیں آیا، دل چلا کہ نہیں چلا، وجد طاری ہوا کہ نہیں ہوا، مزہ آیا کہ نہیں آیا۔

نفسانیت اور روحانیت کا فرق

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ "نفسانیت" اور "روحانیت" ان دونوں میں بڑا باریک فرق ہے، اور یہ پہچاننا بڑا مشکل ہے کہ کیا چیز نفسانیت ہے اور کیا چیز روحانیت ہے، کس چیز میں نفسانیت آرہی ہے اور کس چیز میں روحانیت ہو رہی ہے۔ پھر یہ فرق سمجھانے کے لئے ہم سے ایک سوال کیا کہ ایک شخص ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے، اور اس کے بیٹے جوان ہیں جو کما رہے ہیں، کھا رہے ہیں، بیٹیوں کی شادی کر دی، اور یہ فارغ البال ہے، پنشن مل رہی ہے اور اچھے طریقے سے گزارا ہو رہا ہے، کوئی فکر نہیں، کوئی مشغلہ نہیں۔ اس کا معمول یہ ہے کہ اذان سے بھی پہلے نماز کے لئے تیار ہو کر وضو کر کے تحیۃ الوضوء پڑھتا ہے، اور اذان سنتا ہے، فوراً ہی مسجد میں پہنچتا ہے، پھر اطمینان سے تحیۃ المسجد پڑھتا ہے، پھر سنتیں پڑھتا ہے، اور پھر اطمینان سے جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ نماز کی جماعت کا وقت آ جاتا ہے تو فرض نماز جماعت کے ساتھ اطمینان سے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا ہے، اور اس کو اپنی نماز میں بڑا لطف آتا ہے، اور اس کو نماز میں عجیب نورانیت، سرور اور سکون محسوس ہوتا ہے، ایک حال یہ ہے۔

ٹھیلے والے کی نماز

دوسری طرف ایک شخص وہ ہے جو ٹھیلہ لگاتا ہے، اور صبح سے شام تک آوازیں لگاکر اپنا سامان بیچتا ہے اور اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، اس ذریعہ سے حلال روزی کماتا ہے، مگر جب اذان کی آواز آئی تو اس کو نماز کی فکر لگ گئی، اس نے چاہا کہ میں جلدی گاہکوں کو نمٹاؤں اور پھر نماز ادا کروں، چنانچہ کبھی ایک کو سامان دے رہا ہے کبھی دوسرے کو سامان دے رہا ہے، یہاں تک کہ عین نماز کا وقت آگیا تو اس نے گاہکوں سے کہا کہ میں ابھی نماز پڑھ کر آتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے جلدی سے ٹھیلہ ایک طرف کھڑا کیا اور اس پر کپڑا ڈالا اور بھاگا بھاگا مسجد گیا، جلدی جلدی سے وضو کیا اور صف میں جاکر کھڑا ہو گیا اور حواس باختگی کے عالم میں ''اللہ اکبر'' کہہ کر نیت باندھ لی۔ اب نماز میں کھڑا ہوا ہے، لیکن دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور دل میں یہ خیالات آرہے ہیں کہ کوئی ٹھیلہ پر چوری نہ کرلے، کہیں گاہک نہ بھاگ جائیں وغیرہ، اور نماز بھی پڑھ رہا ہے، جماعت کے بعد جلدی سے اس نے دوسنتیں پڑھیں اور بھاگا بھاگا جاکر دوبارہ ٹھیلہ لگالیا۔ ایک یہ حال ہے۔

روحانیت کس میں زیادہ ہے؟

پھر حضرت والا نے پوچھا کہ بتاؤ کہ پہلا شخص جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، یا اس ٹھیلے والے کی نماز میں

روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر یوں لگتا ہے کہ وہ پہلا شخص جو اذان سے پہلے گھر سے نکلا ہوا ہے، اس نے اطمینان سے تحیۃ الوضوء پڑھی، تحیۃ المسجد پڑھی، سنتیں پڑھیں، اور پھر خشوع و خضوع کے ساتھ دل لگا کر اس نے فرض نماز ادا کی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ دوسری طرف وہ ٹھیلے والا جس نے بھاگا دوڑی میں نماز ادا کرلی، اس کی نماز میں بظاہر روحانیت نہیں ہے۔ لیکن میں یہ سچ کہتا ہوں کہ اس دوسرے شخص کی نماز میں روحانیت پہلے شخص کی نماز سے کہیں زیادہ ہے، اور اس پہلے شخص کو نماز میں جو کیفیات حاصل ہو رہی ہیں، وہ حقیقت میں نفسانی کیفیات ہیں، وہ حظِ نفسانی ہیں، اگرچہ وہ جائز اور محمود حظ نفسانی ہے، مگر روحانیت تو محض عمل سے حاصل ہوتی ہے، اس میں وہ دونوں برابر ہیں۔ بلکہ ٹھیلے والا شخص اس پہلے شخص سے بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے مشاغل اور مصروفیات کے باوجود اللہ کے دربار میں آکر کھڑا ہو گیا، چاہے وہ مختصر وقت کے لئے ہی آگیا ہو مگر تعمیل حکم میں آیا، اس لئے اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔

دوسرے شخص کے عمل میں رسوخ ہے

بہر حال! پہلے شخص کو نماز میں جو "حظ" حاصل ہو رہا تھا وہ "حال" بالمعنی الاوّل ہے اور یہ حال مطلوب اور مقصود نہیں اور مامور بہ نہیں۔ اور دوسرے شخص کا جو عمل ہے اس میں "رسوخ" ہے، اس کو اپنے عمل میں اتنا رسوخ حاصل ہو گیا کہ اپنے شواغل اور مصروفیات کے باوجود ان سب کو

چھوڑ کر نماز ادا کر رہا ہے، یہ "حال" بالمعنی الثانی ہے، یہ مطلوب اور مقصود ہے اور مامور بہ ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، پہلی چیز حاصل ہو یا نہ ہو، اس کا مطالبہ نہیں، اگر ہو جائے تو اللہ کا شکر ادا کرے، اگر نہ ہو تو کوئی پرواہ نہیں۔

عمل میں تسلسل سے رسوخ حاصل ہو جاتا ہے

اب یہ دوسری چیز کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ دوسری چیز یعنی "رسوخ" اصلاً غیر اختیاری ہے، لیکن اس اعتبار سے اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں، اس لئے جب انسان کسی عمل کو کرنا شروع کر دیتا ہے، اور پھر مسلسل اس کو کرتا رہتا ہے تو اس کو اس عمل میں "رسوخ" حاصل ہو جاتا ہے، جیسے میں نے اوپر نماز کی مثال دی کہ نماز پڑھتے پڑھتے رسوخ حاصل ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً روزہ رکھنا بڑا مشکل تھا، لیکن روزے رکھتے رکھتے رسوخ پیدا ہو گیا، اب روزہ دار سے کہو کہ اپنا روزہ توڑ دے تو کبھی بھی وہ روزہ توڑنے کے لئے تیار نہیں ہو گا، اس لئے کہ اب رسوخ پیدا ہو گیا۔

عمل کرنا شروع کر دے

اس رسوخ کے پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ عمل کرنا شروع کر دے، چاہے دل لگے یا نہ لگے، چاہے اس کو کرتے وقت دل کہیں ہو اور دماغ کہیں ہو، لیکن پھر بھی لگا رہے، اور اس فکر میں نہ رہے کہ میرا دل و دماغ کہاں

ہے؟ ارے دل و دماغ جہاں جاتے ہیں، جانے دے، لیکن عمل کرتا رہے، عمل نہ چھوڑے۔ مثلاً نماز کے لئے مسجد میں آ رہا ہے، اب اس وقت دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، پھر بھی مسجد میں آ جا، آنے کو مت چھوڑ۔ اسی طرح جتنے اعمال صالحہ ہیں، ان سب کو کرنا شروع کر دے، چاہے ان کے کرنے کے وقت دل کسمسائے اور تلملائے، دل پر آرے چلیں، مشقت اور محنت معلوم ہو، کوئی لطف و لذت کوئی جوش و خروش نہ ہو، لیکن ان سب کے باوجود ان اعمال کو کرے، اور کرتا رہے، کرتا رہے، یہاں تک کہ چند روز کے بعد ان اعمال میں "رسوخ" پیدا ہو جائے گا، اور حال بالمعنی الثانی حاصل ہو جائے گا۔ اور صوفیاء کی اصطلاح میں حال بالمعنی الثانی کا دوسرا نام "مقام" ہے، اور جب کسی شخص کو کسی عمل میں "رسوخ" حاصل ہو جاتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو اس عمل میں "مقام" حاصل ہو گیا، مثلاً فلاں کو "صبر" کا مقام حاصل ہو گیا، فلاں کو توکّل کا مقام حاصل ہو گیا، فلاں کو شکر کا مقام حاصل ہو گیا، مثلاً جب کوئی اچھی بات سامنے آئی تو اس نے فوراً اللہ کا شکر ادا کیا، اور ایسا بار بار کرتا رہا، یہاں تک کہ شکر کے اندر اس کو رسوخ پیدا ہو گیا اور شکر کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن گیا۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک بات تو یہ بیان فرمائی ہے۔

اللہ کی محبّت غیر اختیاری ہونے کے باوجود مامور بہ کیوں ہے؟

دوسرے اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اشکال کا جواب دیا ہے،

اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے تو یہ اصول بیان فرمایا کہ اختیاری امر مامور بہ ہے اور غیر اختیاری کا انسان مکلّف نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی محبّت کا دل میں پیدا کرنا جو مامور بہ ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت مامور بہ ہے، یہاں تک آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمادیا:

لا یؤمن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین سے اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب محبت غیر اختیاری چیز ہے تو اس کو زبردستی کیسے اپنے دل میں پیدا کریں؟

مامور بہ محبّت طبعی نہیں عقلی ہے

اس کا جواب حضرت والا نے اس ملفوظ میں دیدیا کہ جو محبت مامور بہ ہے وہ محبت طبعی نہیں، بلکہ محبّت عقلی ہے، یعنی جب عقل سے وہ سوچے گا کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ محبّت کے لائق کون ہونا چاہئے؟ تو اس کی عقل اس کو اسی نتیجے پر پہنچائے گی کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ محبّت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونی چاہئے، چاہے دل میں طبعی طور پر محبّت کے جذبات اس طرح اُمڈتے ہوئے محسوس نہ ہوں جس طرح

والدین اور اولاد کے لئے محبت کے جذبات دل میں امڈتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اگر بالفرض کسی کا یہ حال ہو تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کافر ہو گیا، بلکہ وہ سوچے کہ الحمدللہ مجھے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے محبت عقلی حاصل ہے، اگرچہ محبّت طبعی اس درجے کی نہیں ہے۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ

روایت میں آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث سنائی کہ:

لا یؤمن أحد کم حتی اکون أحب الیه من والده وولده و الناس اجمعین۔

تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے اور سب چیزوں سے تو آپ ﷺ زیادہ محبوب نظر آتے ہیں، لیکن مجھے یہ شبہ ہے کہ شاید آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نہیں، اس لئے پھر تو میں مؤمن بھی ہوں یا نہیں؟ یہ سن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی حدیث دوبارہ ارشاد فرمائی اور ان صحابیؓ کے سینے پر ہاتھ مارا، اس وقت ان صحابیؓ نے فرمایا: "الآن" "الآن" "یارسول اللہ ﷺ! اب ہو گیا۔

جملہ "الآن" کی توجیہ

علماء کرام نے ان صحابیؓ کے اس جملے کی مختلف توجیہات کی ہیں، عام

طور پر جو توجیہ کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے سینے پر ہاتھ مارنے سے پہلے وہ محبّت حاصل نہیں تھی، لیکن ہاتھ مارنے کے بعد وہ محبّت حاصل ہوگئی۔ اس لئے انہوں نے فرمایا "الآن" اب مجھے وہ محبّت حاصل ہوگئی۔

بہترین توجیہ

لیکن ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عجیب توجیہ فرمائی ہے، وہ یہ کہ ایسا نہیں تھا کہ ہاتھ مارنے سے پہلے، العیاذ باللہ، وہ صحابی کافر تھے اور ہاتھ مارنے کے بعد مسلمان ہوگئے، اور ہاتھ مارنے سے پہلے محبت کا درجہ حاصل نہیں تھا، اب حاصل ہوگیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تک مؤمن نہیں تھے، ابھی مؤمن ہوئے، ایسا نہیں ہے، بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ اس حدیث سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ ایک مؤمن کے دل میں محبّت عقلی کا ہونا واجب ہے، اور ایمان محبّت عقلی پر موقوف ہے، آپ کا مقصد یہ بیان کرنا نہیں تھا کہ محبّت طبعی پر ایمان موقوف ہے، اور ان صحابیؓ کو جو اشکال ہوا، وہ اس لئے ہوا کہ وہ یہ سمجھے کہ محبّت سے مراد محبّت طبعی ہے، اور محبّت طبعی اس درجے کی حاصل نہیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر جو مارا، اس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ تم اس جملے کا صحیح مطلب نہیں سمجھ رہے ہو، اس لئے کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میری محبّت طبعی سب چیزوں سے زیادہ ہونی چاہئے، بلکہ میرا مقصد یہ ہے

کہ محبّت عقلی زیادہ ہونی چاہئے۔ اس کے جواب میں ان صحابی نے فرمایا "الآن" یعنی اب بات میری سمجھ میں آگئی کہ کس قسم کی محبت مطلوب ہے۔

لہٰذا "الآن" کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کا یہ درجہ پہلے حاصل نہیں تھا، اب حاصل ہو گیا، کیونکہ یہ مطلب لینے کی صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت سے پہلے وہ صحابی مسلمان نہیں تھے اور اب مسلمان ہوئے اور یہ بات بڑی خطرناک ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ "الآن" کے معنی یہ ہیں کہ اب میں حدیث کا مفہوم سمجھا کہ محبّت سے مراد محبت طبعیؔ نہیں بلکہ محبّت عقلی ہے۔

محبّت عقلی اختیاری ہے

یہ محبّت عقلی اختیاری ہے، اور محبّت طبعی غیر اختیاری ہے۔ اس لئے یہ محبّت طبعی مامور بہ نہیں اور ایمان کیلئے موقوف علیہ نہیں اور محبّت عقلی مامور بہ ہے۔ اب محبّت کو حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے؟

محبّت حاصل کرنے کا آسان راستہ

حضرت والا نے "نشر الطیب" میں اس کا راستہ بتا دیا، وہ یہ کہ آدمی پہلے یہ دیکھے کہ اس کائنات میں دوسرے سے محبّت کرنے کے کیا کیا اسباب ہوتے ہیں؟ مثلاً محبت کا سبب یا تو "مال" ہوتا ہے یا "جمال" ہوتا ہے، یا "کمال" ہوتا ہے یا "نوال" ہوتا ہے۔ کسی سے محبّت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ

خوبصورت ہے، کسی سے محبّت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے اندر علمی یا عملی کمالات ہیں، کسی سے محبّت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ بہت سخی ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ تمام اسبابِ محبّت بدرجہ کمال اس طرح موجود تھیں کہ کائنات میں کسی اور کے اندر ثابت نہیں ہیں۔

آپ ﷺ کا جمال دیکھو تو ایسا، کمال دیکھو تو ایسا، نوال دیکھو تو ایسا، اور جب آدمی ان کمالات میں غور کرے گا تو لازماً اس سے عقلی محبّت پیدا ہوگی، چاہے طبعی محبت اس درجے کی پیدا نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو محسوس نہ ہو۔

غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو

بہرحال! اس ملفوظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو، لیکن اختیاری امور میں کوتاہی نہ کرو، اور جب عمل صالح کرنے کا وقت آجائے تو اس کو مت چھوڑو، اور اعمال میں لگے رہو، اگر ساری عمر بھی کیفیات پیدا نہ ہوں تو بھی تمہارا کوئی نقصان نہیں، لیکن عمل میں لگے رہو، یہاں تک کہ "رسوخ" حاصل ہو جائے، یہ پختگی اور دوام ہی مطلوب ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۳۲

حصول نسبت کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۲

صفحات : ۲۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

مجلس نمبر ۳۲

حصولِ نسبت کا طریقہ

الحمدللّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔
والصّلاۃ والسّلام علیٰ رسولہ الکریم ۔
وعلیٰ آلہ واصحابہٖ اجمعین ۔
أمّا بعد!

حصول نسبت کی ترتیب و حقیقت

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

حصول نسبت کی ترتیب اور حقیقت یہ ہے کہ اول بہ تکلف اعمال ظاہرہ و باطنہ کی اصلاح کرے، بالخصوص اعمال باطنہ کی اصلاح زیادہ اہم اور دشوار ہے،

جب اعمال صالحہ ظاہرہ اور باطنہ پر ایک معتد بہ مدت تک مواظبت رہتی ہے تو رفتہ رفتہ ان اعمال میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک کیفیت راسخہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سہولت کے لئے تمام مراقبات، ریاضات، مجاہدات، اذکار اور اشغال مقرر کئے گئے ہیں، باقی اصل چیز اصلاح اعمال ظاہرہ و باطنہ ہی ہے، جس پر نسبتِ حقیقی مرتب ہوتی ہے۔

جب بندہ اعمال صالحہ ظاہرہ و باطنہ پر مداومت کرتا ہے تو حق تعالیٰ کو اس کے ساتھ رضائے دائمی کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یہی حقیقت ہے "نسبت مع اللہ" کی۔ اور صرف ذکر دائم یا دوام حضور یا ملکہ "یاد داشت" جس کو کہتے ہیں وہ نسبت کی حقیقت نہیں، البتہ حصول نسبت میں معین بہت ہے، کیونکہ جس کو ہر وقت حق تعالیٰ کا دھیان رہتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونا مستبعد ہے۔ یہ تو نسبت کی حقیقت ہے۔

حق تعالیٰ کو بندے کے ساتھ ایک خاص تعلق رضا کا ہو جانا جس کا خاصہ ایک خاص انجذاب ہے جس کے لوازم میں سہولت اطاعت اور حضور دائم ہے، اور یہ محض موہوب ہے، کیونکہ کسی عمل صالح میں یہ قابلیت

نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کافی ہو سکے، گو عادۃ اللہ یہ ہے کہ محض اپنے فضل سے اپنی رضا کو اعمال صالحہ پر مرتب فرما دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنّت میں نہ جائے گا، بلکہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے جائے گا۔ اور یہ نسبت مع اللہ عادۃً پھر کبھی زائل نہیں ہوتی، جیسے بالغ ہونے کے بعد صفت بلوغ کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اسی مسئلے کو صوفیاء نے بعنوان "فناء" تعبیر کر کے فرمایا ہے کہ:

"الفانی لایردّ"

یعنی فانی اور واصل کبھی مردود نہیں ہوتا۔

اگر یہ شبہ ہو کہ بعد وصول و حصول نسبت کے بھی تو معاصی کا صدور ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے پھر رضائے دائمی کا تحقق کہاں رہا؟ تو سمجھ لو کہ گہری دوستی کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی باہم شکر رنجی بھی نہ ہو، گاہے گاہے شکر رنجی بھی ہو جاتی ہے، لیکن تدارک کے بعد پھر ویسا ہی تعلق ہو جاتا ہے، بلکہ دراصل اس خفگی کے زمانے میں بھی دوستی کا اصل تعلّق بدستور قائم رہتا ہے، وہ زائل نہیں ہوتا، شکر

رنجی محض عارضی ہوتی ہے۔

مثلاً تکمیل صحت کے بعد ضروری نہیں کہ اس حالت میں کبھی زکام بھی نہ ہو، یا کبھی اگر بد پرہیزی کرلے، مثلاً گڑ کھالے تو اس سے نقصان نہ ہو، بدپرہیزی سے نقصان ضرور ہوگا، لیکن محض عارضی تدارک کے بعد پھر وہی حالتِ غالبہ صحت کی عود کر آئے گی۔ یا مثلاً درسیات کے فراغ کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی کسی مقام پر اٹکے ہی نہیں، کہیں کہیں بعد فراغ بھی اٹکتا ہے، لیکن ذرا توجہ سے پھر چل نکلتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷)

یہ حضرت والا کا طویل ملفوظ ہے، اور سارے تصوف اور طریقت کا جو مقصود سمجھا جاتا ہے یعنی اللہ جلّ شانہ سے "نسبت کا حصول" اس ملفوظ میں حضرت والا نے اس "نسبت" کا مطلب اور اس کی حقیقت اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں بڑے "صاحبِ نسبت" بزرگ ہیں، یا بڑے "صاحب نسبت ولی اللہ" ہیں، فلاں کو "نسبت" حاصل ہوگئی ہے۔ یا جیسے آپ نے صوفیاء کے تذکروں میں یہ سنا ہوگا کہ ایک بزرگ کی جب دوسرے بزرگ سے ملاقات ہوئی تو ایک بزگ نے دوسرے بزرگ کی

"نسبت" معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان کی "نسبت" کس معیار کی ہے؟ کس درجے کی ہے؟ وغیرہ۔

"نسبت" حاصل ہونے کا مطلب

حضرت والا اس "نسبت" کی حقیقت بیان فرمارہے ہیں کہ "نسبت" حاصل ہونے کے معنی درحقیقت یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ اس بندے سے راضی ہیں اور اس کی عبادات اور طاعات کو قبول فرمارہے ہیں، اور بحیثیت مجموعی اس بندے کے اعمال کو پسند فرماتے ہیں، جب یہ کیفیت حاصل ہو جائے تو کہا جائے گا کہ اس کو "نسبت مع اللہ" حاصل ہوگئی۔

"نسبت" حاصل ہونے کی دو علامتیں

لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ فلاں بندے کو "نسبت" حاصل ہوگئی اور یہ کیسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہیں؟ تو نسبت حاصل ہونے اور اللہ تعالیٰ کے بندے سے راضی ہونے کی دو علامتیں ہیں، ایک "کثرت ذکر" دوسری "دوامِ طاعات" دوام طاعات کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے عائد کردہ جو فرائض و واجبات ہیں ان کو پابندی سے بروقت انجام دے رہا ہے، اور جن چیزوں سے شریعت نے روک دیا ہے ان سے ہر حالت میں رکا ہوا ہے، ظاہری و باطنی ہر طرح کے گناہوں سے اجتناب کر رہا ہے، نسبت کی ایک علامت یہ ہے۔ اور دوسری چیز کثرت ذکر ہے،

"کثرت ذکر" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زبان اور اس کا دل بیشتر اوقات اللہ جل جلالہ کی طرف متوجہ رہتے ہوں، یا تو وہ زبان سے ذکر میں مشغول ہے، یا اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح لگا ہوا ہے کہ اگر خیال ہے تو اللہ تعالیٰ کا، اگر فکر ہے تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی، اس کی زبان پر کبھی ذکر ہے، کبھی کلمہ شکر ہے، کبھی کلمہ صبر ہے، کبھی استغفار ہے، کبھی استعاذہ ہے، ہر وقت کسی نہ کسی بہانے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جڑا ہوا ہے، جب دیکھو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا ہے اور چلتے پھرتے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے، اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ:

"دل بیار دست بکار"

ہاتھ کام میں لگے ہوئے ہیں، دیکھنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ شخص دنیا کے کام میں لگا ہوا ہے، لیکن اس کا دل اللہ جل شانہ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ یہ بڑے اعلیٰ درجے کی کیفیت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو یہ کیفیت عطا فرما دے۔ آمین۔ ہر وقت کے دھیان کی اسی کیفیت کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "ملکہ یاد داشت" بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بسی ہوئی ہے، اسی کا دھیان دل میں جما ہوا ہے۔

یہ دل ایک ہی ذات کی تجلّی گاہ ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دل اپنے لئے بنایا ہے، اور تمام اعضاء کو تم دنیا کے کاموں

میں لگادو، لیکن یہ دل تو صرف ایک ہی ذات کی تجلّی گاہ ہے، اسی ذات کو اس کے اندر جلوہ افروز ہونا چاہئے، کسی اور کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لو کنت متّخذاً لا تخذت أبابکر خلیلاً

(ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب أبی بکرؓ)

یعنی اگر دنیا میں کسی کو صحیح معنی میں دلی دوست بنانا ہوتا تو میں "ابوبکر" (رضی اللہ عنہ) کو بناتا، لیکن چونکہ دنیا میں کسی کو دلی دوست بنانا ہی نہیں، ایسا دوست جو "خلیل" ہو، یعنی جو دوسروں سے غافل کردے اور جس کا خیال دل میں سمایا ہوا ہو، جس کی ہر وقت دھن لگی ہوئی ہو، ایسا دوست میں دنیا میں کسی کو بنانا ہی نہیں چاہتا، ایسا دوست تو وہ ایک ہی ذات ہے جو دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ "دل" انہی کے لئے ہے، انہی کی "تجلّی گاہ" اور انہی کی "فرودگاہ" ہے، اس میں وہ کسی اور کو برداشت نہیں کرتے کہ اس کے اندر کوئی سما جائے۔ ٹھیک ہے کہ جب تم دنیا کے اندر زندگی گزار رہے ہو، تو لوگوں سے تعلقات رکھو، دنیاوی ضروریات پوری کرو، اپنی خواہشات کو جائز حدود کے اندر رہ کر پورا کرو، لیکن اس دل کے اندر سوائے اللہ جل شانہ کے کوئی اور نہ سمائے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ دولت عطا فرمادے۔ آمین۔

خوبصورت دعا، خوبصورت شعر

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کتنی خوبصورت دعا مانگا کرتے تھے کہ:

اَللّٰھُم اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَ شْيَاءِ اِلَيَّ
وَ اجْعَلَ خَشْيَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْيَاءِ عِنْدِیْ

اے اللہ! تمام اشیاء کی محبتوں پر اپنی محبت کو غالب فرما، اور تمام چیزوں کے خوف پر اپنے خوف کو غالب فرما۔ میں نے بھی کسی وقت ایک شعر کہا تھا کہ:

آتی متاعِ قلب کو رکھنا سنبھال کے
قسمت سے اس گھر پہ دل اس دلربا کا ہے

یعنی اس دل پر تو اس کا دل آیا ہوا ہے، اس لئے اس کو سنبھال کر رکھنا، یہ اِدھر اُدھر پھینکنے کی چیز نہیں ہے۔

یہ اللہ کی رضامندی کی علامت ہے

بہرحال! اگر یہ "کثرت ذکر" حاصل ہو جائے جس کا نام "ملکۂ یاد داشت" ہے، تو یہ ایک علامت ہے حصول "نسبت" کی، اور جب یہ دونوں چیزیں یعنی دوام طاعات اور کثرت ذکر حاصل ہو جائے یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگئی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ

کی رضا حاصل ہو گئی تو اور کیا چاہئے؟ کیونکہ اس کائنات میں اس سے بڑا مقصود اور اس سے بڑا انعام کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ راضی ہو جائیں۔ یہ ہے حصول "نسبت" کی حقیقت، جس کو مختصراً یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ "نسبت" سے مراد "رضائے باری تعالیٰ" ہے جس کی علامت "ملکۂ یاد داشت اور دوام طاعت" ہے۔

"نسبت" حاصل کرنے کا طریقہ

اس "نسبت" کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام اعمال صالحہ جن میں اعمال صالحہ ظاہرہ بھی داخل ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، اور اعمال صالحہ باطنہ بھی داخل ہیں جیسے شکر، صبر، توکّل، تواضع وغیرہ، یہ تمام اعمال بہ تکلف اور بمشقت کرتا رہے، یعنی ان کے انجام دینے میں اگرچہ تکلف اور مشقت ہو رہی ہو، اور دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن زبردستی نفسانی خواہشات کو کچل کر اور دل کو موڑ کر یہ اعمال کرتا رہے، یہ اعمال کرنے کے نتیجے میں خود رفتہ رفتہ حالت راسخہ پیدا ہو جاتی ہے، اور اس حالت راسخہ پر "ملکۂ یاد داشت" مرتب ہو جاتا ہے، پھر "ملکۂ یاد داشت" پر "نسبت" بھی مرتب ہو جاتی ہے۔

اس طریق کا سنہری اصول

لہٰذا "نسبت" حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ

انسان اعمال صالحہ بہ تکلّف کرتا رہے۔ اور اس طریق کا سنہری اصول یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو رہی ہو اسی طاعت کو انجام دو، اور جس معصیت سے بچنے میں سستی ہو رہی ہو اسی معصیت سے زبردستی بچنے کا اہتمام کرو، اور طے کرلو کہ چاہے دل پر آرے ہی چل جائیں لیکن یہ کام نہیں کروں گا، بس جس دن یہ کام شروع کر دیا بس اس دن سے کامیابی کے راستے پر چل پڑے۔

نفس و شیطان کمزور ہیں

یاد رکھو! شیطان کا مکر ویسے تو بڑا طاقتور معلوم ہوتا ہے، لیکن قرآن کریم نے فرمایا دیا:

اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفاً۔

(سورۂ نساء، آیت ۷۶)

یعنی شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے۔ اسی طرح نفس کا مکر بھی ضعیف ہے۔ ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس نفس اور شیطان کے سامنے ڈٹ گیا، یہ اس کے آگے پگھل جاتے ہیں، یہ نفس و شیطان کمزوروں پر شیر ہیں اور مضبوط آدمی کے آگے رام ہیں، جو آدمی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دے تو یہ اس پر سوار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے میرا شکار، اور پھر اس کو ڈھا دیتے ہیں، اور جو آدمی ان کے سامنے ڈٹ گیا کہ نہیں، میں اس کی بات نہیں مانوں گا، اس کے آگے یہ چھوئی موئی ہو جاتے

ہیں۔

بہر حال، اصل کام ان کے سامنے ڈٹنے کا ہے، اور ڈٹنے میں تھوڑی محنت اور مشقت اور تکلیف ہوتی ہے، لیکن ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کے سامنے ڈٹ کر دیکھو۔ اپنی خواہشات کو کچل کر دیکھو، اور خواہشات کے کچلنے سے جو تمہیں تکلیف ہوگی وہ تکلیف خود تمہارے درجات کی بلندی کا باعث ہوگی اور یہ مجاہدہ تمہیں کہاں سے کہاں پہنچادے گا۔

"نفس" دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے "قصیدہ بردہ" میں نفس کی کیا خوبصورت مثال بیان فرمائی ہے۔ فرمایا کہ:

اَلنَّفْسُ کَا لطِّفْلِ اِنْ تُھْمِلْهُ شَبَّ عَلٰی
حُبِّ الرِّضَاعِ وَاِنْ تُفْطِمْهُ یَنْفَطِمِ

یعنی نفس کی مثال دودھ پیتے بچے جیسی ہے، اگر تم بچے کو دودھ پینے کی حالت پر چھوڑ دو تو وہ بچہ بوڑھا ہو جائے گا مگر دودھ پینا نہیں چھوڑے گا، اس لئے کہ اس کا نفس دودھ پینے کی محبت میں لگا ہوا ہے، اور جب ماں باپ اس کو دودھ چھڑاتے ہیں تو وہ روتا ہے، چیختا ہے، اس کو تکلیف ہوتی ہے، اور ماں اس کا دودھ چھڑانے کے لئے پستانوں پر ایلوا وغیرہ کڑوی چیز لگا لیتی ہے، تاکہ بچے کو اس سے نفرت پیدا ہو، اب اگر ماں باپ اس کے چیخنے چلانے پر ہتھیار ڈالدیں اور یہ سوچیں کہ یہ تو بہت چیختا ہے، خود بھی نہیں

سوتا، ہمیں بھی نہیں سونے دیتا، لہٰذا اس کا دودھ نہیں چھڑاتے، اس کو دودھ پینے دو، تو اس صورت میں وہ بچہ بوڑھا ہو جائے گا مگر دودھ پینا نہیں چھوڑے گا، لیکن اگر ماں باپ نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ اس کا دودھ چھڑوانا ہے، چاہے یہ چیخے یا چلائے، روئے یا کچھ بھی کرے، ہم اس کو دودھ نہیں دیں گے، اگر تین دن تک یہ کرلو گے تو چوتھے دن اس کا دودھ چھوٹ جائے گا۔

نفس کے سامنے ڈٹ جاؤ

انسان کے نفس کا بھی یہی معاملہ ہے، اگر تم اس کو اس کی خواہشات کے پورا کرنے میں ڈھیل دیتے رہو گے تو تمہیں اپنے چکر میں مبتلا رکھے گا، لیکن جس دن تم اس کے سامنے ڈٹ گئے کہ مجھے اس کی خواہشات کو چھڑانا ہے، اس دن یہ چھوڑ ہی دے گا۔ اور جب یہ نفس خواہشات کو کچلنے کا عادی بنے گا اور اس کچلنے کے نتیجے میں جو جلا پیدا ہوگی، وہ تمہیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچادے گی، لیکن ایک مرتبہ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا یہ جتنے مجاہدات اور مراقبات ہوتے ہیں ان کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پانے کی کوشش کرے، اور جیسے جیسے انسان اپنی خواہشات پر چوٹیں مارتا ہے اور ان کو کچلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنا مقام قرب عطا فرماتے رہتے ہیں۔

نفسانی خواہشات تقویٰ کے لئے ایندھن ہے

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن است

کہ ازو حمام تقوی روشن است

کہ دنیا کی ان خواہشات کی مثال ایندھن یعنی لکڑی جیسی ہے، اس لئے دل میں جو خواہشات پیدا ہو رہی ہیں ان کو بیکار مت سمجھو، ان کو خراب مت سمجھو، یہ بڑے کام کی چیز ہے، وہ یہ کہ یہ خواہشات "ایندھن" ہے، اس کو جلاؤ، جتنا اس کو جلاؤ گے اتنا ہی اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہوگا، تمہارے دل میں تقویٰ کی روشنی پیدا ہوگی۔ لہٰذا ان خواہشات کو بیکار مت سمجھو، دل میں جو خواہشات ابھر رہی ہیں کہ یہ کام کرلوں، یہ کام کرلوں، آنکھ کو غلط جگہ پر استعمال کرلوں، زبان سے غیبت کرلوں، کان کو غلط استعمال کرلوں، ان کو بیکار مت سمجھو،

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اور مصلحت جان کر پیدا فرمایا ہے، وہ یہ کہ ان کو جلاؤ، جب ان کو جلاؤ گے تو تمہارے دل میں تقویٰ پیدا ہوگا، اگر ان خواہشات کو دبانے میں دل پر چوٹیں لگیں تو لگنے دو، صدمہ پہنچے تو پہنچنے دو، تکلیف ہوتی ہے تو ہونے دو ۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جتنا یہ دل ٹوٹے گا اتنا ہی اس بنانے والے کی نگاہ میں عزیز ہوگا، یہ کام کر کے دیکھو، پھر اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ وہ حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کا کوئی جواب نہیں، اس کے آگے گناہوں کی حلاوتیں اور لذتیں ہیچ در ہیچ ہیں۔

"نسبت" حاصل ہونے کے بعد زائل نہیں ہوتی

بہر حال، تکلف کے ساتھ اعمال صالحہ ظاہرہ اور باطنہ کو انجام دیتے رہنا، یہ عمل انسان کو "کثرت ذکر" اور "دوام طاعت" کی طرف لے جاتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں حصول "نسبت مع اللہ" کی علامتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل سے یہ "نسبت" ہم سب کو عطا فرما دے، آمین۔ اور جب یہ "نسبت" ایک مرتبہ حاصل ہو جائے تو پھر جاتی نہیں، البتہ درمیان میں بعض اوقات کچھ گرد و غبار آ جاتا ہے، مثلاً کچھ غلطی ہو گئی، کہیں بھول چوک ہو گئی، کوئی گناہ سرزد ہو گیا، تو اس وقت درمیان میں عارضی قسم کی خلش آ جاتی ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد توبہ استغفار کے نتیجے میں یہ خلش اور رنجش ختم بھی ہو جاتی ہے۔

دیکھئے! کوئی شخص کتنا بھی بڑے سے بڑا ولی اللہ ہو جائے، وہ معصوم نہیں ہوتا، ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی کبھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ اس غلطی کے سرزد ہونے سے دل میں عارضی تکدّر پیدا ہو جاتا ہے، لیکن جب

وہ توبہ و استغفار کرلیتا ہے تو وہ کدورت صاف ہو جاتی ہے۔ بہر حال! اس ملفوظ میں حضرت والا نے "نسبت" کی حقیقت، "نسبت" کی علامت، "نسبت" کے حصول کا طریقہ اور اس کا نتیجہ بیان فرمایا ہے۔

نسبت کے تحقّق کے لئے رضائے تام شرط ہے

فرمایا کہ:

"نسبت" متحقّق ہوتی ہے کامل رضائے حق پر، نہ کہ مطلق رضائے حق پر، کیونکہ رضا تو ہر فعل حسن پر مرتب ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص زنا کرے اور اس کے بعد نماز بھی پڑھے تو زنا پر ناراضی مرتب ہوگی لیکن نماز پر رضا بھی مرتب ہوگی، افعال قبیحہ و حسنہ پر اپنی اپنی جگہ برابر ناراضی اور رضا مرتب ہوتی رہتی ہے، لیکن "نسبت" کے تحقق کے لئے رضائے تام شرط ہے۔

(انفاس عیسی، ص ۱۸)

یعنی یہ نہیں کہ بعض گناہ تو چھوڑ دیے اور بعض گناہ ابھی باقی ہیں، بعض اعمال واجبہ کو انجام دے رہا ہے اور بعض اعمال چھوڑ رکھے ہیں۔ اس پر "نسبت" حاصل نہیں ہوتی، اگرچہ جو اچھے اعمال کر رہا ہے وہ اعمال رضا کا سبب تو ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر راضی بھی ہیں، لیکن ساتھ میں وہ ناراضی کے

کام بھی کر رہا ہے، اس لئے رضائے تام اس کو حاصل نہیں، اور جب رضائے تام حاصل نہیں تو اس پر "نسبت" کا بھی تحقق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ نسبت کے تحقق کے لئے رضائے تام شرط ہے۔

رضائے ناتمام کی مثال

آگے فرمایا کہ:

"رضاء ناتمام کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے مرض کی حالت میں عارضی افاقہ ہو جائے، گو وہ بھی بسا غنیمت ہے۔

(انفاس عیسی، ص ۱۸)

اگر مرض میں عارضی طور پر تھوڑی بہت صحت حاصل ہو جائے تو وہ صحت بھی نہ ہونے سے بہتر ہے، اسی طرح ایک آدمی گناہ ہی گناہ کر رہا ہے، نیکی کرتا ہی نہیں، اس کے مقابلے میں وہ شخص یقیناً بہتر ہے جو گناہ بھی کرتا ہے اور نیکی بھی کرتا ہے ؎

این ہم کن آں ہم کن تا غلبہ کرا باشد

لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان گناہ کرے ہی نہیں، جو کام بھی اس سے سرزد ہو وہ اللہ کی رضا کے مطابق ہو، یہ ہے رضائے کامل، اس کے بغیر "نسبت" حاصل نہیں ہوتی۔

اعمال صالحہ میں لگے رہو

بہر حال، یہ سب الفاظ تو طریقت کی "اصطلاحات" ہیں، ان کو محض جان لینے سے کام نہیں چلتا، اسی لئے فن سلوک کی اصطلاحات کے بارے میں ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میاں "اصطلاحات" کے پھیر میں مت پڑو، بس سیدھی سیدھی بات کیا کرو، اور سیدھی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ میں لگے رہو، اعمال ظاہرہ بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہوں اور اعمال باطنہ بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہوں، گناہوں سے اجتناب ہو اور طاعت کی بجاآوری ہو، بس اس میں لگے رہو، اور جب ان میں سستی ہو تو اس کا مقابلہ کرو اور تکلیف ہو تو اس کو برداشت کرو، جب یہ کرتے رہو گے تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ منزل تک پہنچ جاؤ گے اور "نسبت مع اللہ" حاصل ہو جائے گی۔

نتائج اور ثمرات کی فکر میں مت پڑو

نتائج اور ثمرات کی فکر میں زیادہ مت پڑو کہ ہر وقت سوچتے رہو کہ اب میں کہاں پہنچا؟ اب کہاں پہنچا؟ بلکہ کام کرتے جاؤ، بالآخر خود بخود مطلوب حاصل ہو جائے گا، چاہے تمہیں پتہ چلے یا نہ چلے کہ "نسبت" حاصل ہو گئی، ارے آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے؟ اگر تمہیں پتہ نہ چلے کہ "نسبت" حاصل ہوئی یا نہیں؟ لیکن ہو گئی تو اللہ کا کرم ہے۔

بچہ کس طرح بالغ ہو جاتا ہے

ہمارے حضرت مثال دیا کرتے تھے کہ دیکھو، بچہ روزانہ بڑا ہوتا ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے بچے کو اسکیل سے روزانہ ناپا کرے کہ آج کتنا بڑا ہوا، کل کتنا بڑا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص مایوس ہو جائے گا اور کہے گا کہ میرا بچہ تو بڑا ہی نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ بچے کے بڑھنے کا عمل اتنا غیر محسوس ہے اور اتنا کم ہے کہ وہ اسکیل میں آتا ہی نہیں، لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ بچہ بڑا نہیں ہو رہا ہے، روزانہ بڑا ہو رہا ہے، اگرچہ اس کے بڑھنے کی رفتار دھیمی ہے، لیکن بڑھ رہا ہے اور بڑھتے بڑھتے اچانک ایک دن وہ "بالغ" ہو جائے گا، اور اس بچے کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ میں بالغ ہو گیا۔ اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے کو "بالغ" ہونے کی اصطلاح اور تعریف معلوم نہیں ہوتی، اس لئے وہ یہ نہیں کہتا کہ میں آج بالغ ہو گیا، اس لئے کہ عام طور پر کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں فلاں تاریخ کو بالغ ہوا تھا، کیونکہ اس کو پتہ ہی نہیں کہ بالغ کیا ہوتا ہے اور نابالغ کیا ہوتا ہے۔ تو دیکھئے! اصطلاح معلوم نہ ہونے کے باوجود وہ رفتہ رفتہ "بالغ" ہو گیا۔ اسی طرح فرمایا کہ عمل صالح کرتے جاؤ اور اسی میں لگے رہو، انشاء اللہ ایک دن "نسبت" حاصل ہو جائے گی، چاہے تمہیں پتہ چلے یا نہ چلے، اور جس دن اللہ تعالیٰ نے یہ "نسبت" اور تعلق مع اللہ کی دولت عطا فرما دی تو بس بیڑا پار ہے۔

خلاصہ

البتہ حضرت والاؒ کے ارشاد سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ محض ملکۂ یاداشت حاصل ہو جانے پر بے فکر نہ ہو جانا چاہئے جب تک کہ دوام طاعت اس کے ساتھ ساتھ نہ پیدا ہو جائے، بہت سے لوگوں کو اسی سے دھوکہ ہو گیا ہے، نسبت مع اللہ نہ تو گناہوں کے ارتکاب کرتے رہنے کے ساتھ قائم ہوتی ہے نہ محض حضوری کی وقتی کیفیات کے ساتھ۔ بس خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں لگے رہو، اور اس فکر میں مت پڑو کہ کیا نتائج اور ثمرات مرتب ہو رہے ہیں، بلکہ اس کی فکر کرو کہ جو تم عمل کر رہے ہو وہ درست ہو اور صحیح راستے پر ہو، اور وہ سنت کے مطابق ہو، اس میں لگے رہو، انشاء اللہ تعالیٰ سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ